جمہوریت کا مسئلہ یہی ہے

روزنامہ جنگ کے کالم نگاروں حامد میر، ارشاد احمد حقانی اور خورشید احمد ندیم وغیرہ نے گزشتہ دنوں صوبہ سرحد میں ضلعی انتخابات کے ضمن میں ایم ایم اے کی دو اہم جماعتوں جمعیت العلمائے اسلام اور جماعت اسلامی کی جانب سے مختلف سطحوں کے انتخابات میں نظریاتی مخالف جماعتوں کے ساتھ ضلعی سطحوں پر اتحاد کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ تنقید مغربی فلسفیانہ تناظر کے ادراک سے عاری ہے اور خالص تنقید ہے۔ عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے بخوبی واقف ہے لیکن مدمقابل جاہلی تہذیب، جاہلیت خالصہ اور جاہلیت جدیدہ سے قطعاً واقف نہیں۔ جمعیت العلمائے اسلام نے اے این پی اور جماعت اسلامی نے مسلم لیگ سے تعاون کو ترجیح دی جو افسوسناک معاملہ ہے۔ دوسری جانب صوبہ سرحد کی تمام سرکاری، مذہبی، دینی ولادینی جماعتوں میں مختلف سطحوں پر انتخابات میں عورتوں کے حق رائے دہی پر قدغن لگانے کے سلسلے میں سرحد کے ۱۲ اضلاع اور ۳۰ سے زائد یونین کونسلوں میں باہمی معاہدے طے پائے جن کی بنیاد دین کے کسی اصول کے بجائے محض قبائلی روایات پر رکھی گئی تھی لہٰذا جیسے ہی حکمران مسلم لیگ نے بعض مقامات پر مجبوراً اس معاہدے کی تنسیخ کا اعلان کیا احتجاجاً دینی جماعتوں نے فوری طور پر خواتین امیدواروں کو انتخابات میں کھڑا کرنے کا اعلان کر دیا۔ اگر یہ قدغن کسی دینی اصول کی بنیاد پر لگائی جاتی تو کسی فریق کی جانب سے خلاف ورزی کے باوجود دینی جماعتیں اس قدغن پر عامل رہتیں۔ افسوس یہ ہے کہ سیاست میں صرف مفادات، رواج اور رسومات کی بنیاد پر معاہدے کیے جاتے ہیں۔ اس کا دین اور دین اقدار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جماعت اسلامی کراچی کے زیر اہتمام صوبہ سرحد میں عورتوں کو رائے دہی سے محروم کرنے کے مسئلے پر زبردست احتجاجی مظاہرے کا انتظام کیا گیا۔ واضح رہے کہ ۱۹۷۹ء اور اس کے بعد بھی کئی مرتبہ کراچی میں پشتون اکثریت کے تمام علاقوں میں جماعت اسلامی، نیپ اور دیگر جماعتوں کے درمیان یہ معاہدے طے پائے کہ ان کے حلقہ ہائے انتخابات میں کوئی عورت رائے دہی کا حق استعمال نہیں کرے گی لہٰذا اس پہلو سے

احتجاجی مظاہرے کا جواز خود بہت سے سوالات پیدا کر دیتا ہے۔ یہ سوال کہ عورت ووٹ ڈالے یا نہ ڈالے، ضمنی سوال ہے اصل سوال یہ ہے کہ جمہوری عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کافرانہ نظام کو مضبوط کرنا دین کا تقاضہ ہے یا وقتی مصالح کا تقاضہ یہ ایک عارضی حکمت عملی ہے یا جمہوریت پر ایمان سے انحراف ممکن نہیں رہا۔ کیا جمہوریت عین اسلام ہے اور جمہوریت کے ذریعے ہی شریعت پر عمل ممکن ہے؟ کیا جمہوریت کے نتیجے میں شریعت غالب ہوتی ہے یا مفادات پرستی کو غلبہ ملتا ہے، کیا جمہوریت ہر روایت، ہر قدر، ہر مذہب کو تحلیل نہیں کر دیتی اور تمام اجتماعیتوں کا خاتمہ نہیں کرتی؟ کیا جمہوریت کے نتیجے میں حرص وحسد یعنی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے سوا کسی اور ذہنیت کا پیدا ہونا ممکن رہتا ہے؟ جمہوری عمل میں شریک ہر امیدوار اپنے ووٹر کو خدا ماننے پر مجبور ہے یا نہیں اور اصل حاکمیت اللہ کے بجائے جمہور کو منتقل ہوتی ہے یا نہیں؟ سو سال کی تاریخ اس کا موثر جواب ہے۔ ترکی، سوڈان، پاکستان میں اسلامی تحریکوں کے تجربات انتخابی نتائج کے اثرات نے جمہوریت اور جمہوری عمل کی کافرانہ حیثیت کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ جمہوری عمل کے نتیجے میں تمام دینی جماعتوں، دینی تحریکوں کا اسلامی تشخص شدید مجرح ہوا ہے، بلکہ بیشتر مقامات پر یہ دینی جماعتیں سیاست مصلحت حکمت، عارضی فوائد کے تحت مسلمہ اسلامی اصولوں سے انحراف کرنے پر مجبور ہوئی ہیں۔ انحراف کا اعتراف کرنے کے بجائے اس کی تاویلیں کر کے دین کو بازیچہ اطفال بنا دیا گیا ہے اور مغربی فلسفے وتہذیب میں اسلام کو سمونے کے لیے اور ایک محفوظ جگہ بنانے کے لیے دین کی نئی تعبیر و تشریح پیش کی جا رہی ہے۔ مثلاً چند اسلامی تحریکوں نے دارالحرب کی اصطلاح کو دارالدعوت کی اصطلاح سے تبدیل کر دیا ہے۔ اب مغرب دارالحرب نہیں دار دعوت ہے حالانکہ یہی اسلامی تحریکیں کل تک لال قلعہ پر اسلامی پرچم لہرانے کا اعلان کرتی تھیں۔ اس طرح امت کی پندرہ سو سالہ تاریخ کی نفی کر دی گئی ہے۔ مغربی فلسفے سے عدم واقفیت کے باعث بعض علماء جمہوریت کو عین اسلام سمجھتے ہیں لیکن مغربی اور اسلامی تاریخ اور فکر سے واقف کوئی شخص جمہوریت کو شرعی لبادہ عطا نہیں کر سکتا۔ مائیکل مین کی کتاب The dark side of democracy اس جمہوریت کا اصل چہرہ ایک دوسرے تناظر کے تحت تاریخ کی روشنی میں دکھاتی ہے۔

دینی جماعتوں کے مابین فکر ونظر کی یکسانیت کے باوجود یہ صورتحال اصل مسئلے سے صرف نظر کے باعث پیدا ہوئی ہے جس کو کلی طور پر سمجھے بغیر جزوی مسائل میں الجھنے کا نتیجہ یہ انتشار، اضطراب اور افتراق ہے۔ اس معاملے کی تفصیل جاننے کے لیے ساحل کے شمارہ مارچ، اپریل اور مئی ۲۰۰۵ء کا مطالعہ ضروری ہے جس میں جدیدیت و روایت کی کشمکش میں اس اہم موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ صدر بش نے دوسری مرتبہ صدر منتخب ہونے کے بعد تقریب حلف برداری سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ہم دنیا کے تاریک براعظم اور تاریک غار کے اندر بھی آزادی اور جمہوریت کی شمع روشن کریں گے خواہ اس کی کوئی قیمت ادا کرنی پڑے''۔ سوال یہ ہے کہ

آزادی اور جمہوریت آخر کونسی اقدار ہیں جس کے لیے امریکی صدر اس قدر بے چین و بے تاب ہیں؟ افغانستان پر حملہ ہو یا عراق پر اسے آزادی اور جمہوریت کی بحالی کے لیے حملہ قرار دیا جاتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب و فلسفہ کے طوطے کی جان ان دو اصطلاحات آزادی اور جمہوریت میں قید ہے۔ یہ جمہوریت ہی کی تو اثر آفرینی تھی کہ ایم ایم اے کو صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں جہاد میں شمولیت اور طالبان کی حمایت کے باعث کامیابی حاصل ہوئی لیکن اقتدار ملتے ہی دونوں صوبائی حکومتیں اور ان کی سرپرست جماعتیں طالبان سے مصلحتاً لاتعلق ہو گئیں پھر یہ مصلحت ایک دینی قومی اور اب ملی ضرورت بن گئی اور جہاد افغانستان سے برسوں کی وابستگی قصہ پارینہ بن گئی۔ اگر جہاد افغانستان جہاد نہیں تھا اس میں شرکت کے لیے آنے والے مجاہدین مجاہدین نہیں تھے تو پاکستانی قوم کو ۱۹۷۹ء سے ۲۰۰۲ء تک جہادی سرگرمیوں میں کیوں شریک کیا گیا؟ معاملہ صرف یہیں تک نہیں رہا طالبان کی باقیات، جہاد کی اصطلاح، مجاہدین سب سے رشتہ منقطع کر لیا گیا۔ صوبہ سرحد میں مجاہدین کے خلاف تاریخی آپریشن سرحد حکومت کی سرپرستی میں کیا گیا، ہزاروں گھر مسمار ہوئے، کروڑوں کی املاک تباہ ہوئیں، بے شمار مجاہدین گرفتار اور شہید ہوئے، عورتیں، بچے خاندان، قبیلے تہس نہس، تتر بتر منتشر ہوئے، لیکن پورے صوبہ سرحد میں نہ اس پر احتجاج ہوا نہ کبھی ہڑتال ہوئی، نہ کبھی اس مسئلے کو انتہائی اہمیت کے مسائل کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ مجاہدین کی زندگی بچانے ان کے اہل خانہ کو تحفظ دینے کے لیے ثالثی کی ضرورت تک محسوس نہیں کی گئی، یہ مجرمانہ غفلت جمہوریت کا شاخسانہ ہے، دنیا بھر سے بے شمار مجاہدین مذہبی جماعتوں کی سرپرستی کے باعث صوبہ سرحد میں آباد ہوئے لیکن جمہوریت کی خاطر ان مجاہدین کو نظر انداز کر دیا گیا۔ المیہ یہ ہے کہ صوبہ سرحد و بلوچستان میں کوئی دینی جماعت و دینی تحریک مجاہدین کے حق میں آواز نہیں اٹھا رہی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دینی تحریکوں اور دینی جماعتوں کے لیے مجاہدین کے آسیب سے بچنا اور اپنے آپ کو ان سے لاتعلق ظاہر کرنا زندگی، موت اور عقیدے کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اخبارات کے کالم نگار جو کل تک جہاد اور جہادی تحریکوں کے حامی تھے اب خاموش ہیں بلکہ اسے دہشت گردی قرار دے رہے ہیں۔ فکر و نظر کی یہی منافقت جمہوریت کی روح ہے۔ ہر جمہوری معاشرہ اقدار و روایات تہذیب و اخلاقیات کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور تمام جمہوری معاشرے اخلاقی گراوٹ کی آخری انتہا پر ہوتے ہیں۔ ایم ایم اے نے مہنگائی، انتخابات میں دھاندلی جیسے چھوٹے مسائل پر ملک گیر احتجاج کیے لیکن صوبہ سرحد میں مجاہدین کے خلاف جاری آپریشن پر مکمل خاموشی اختیار کی گئی کیونکہ اس کے نتیجے میں دونوں صوبوں کی حکومتوں سے دستبردار ہونا پڑتا لہٰذا اقتدار خون مسلم کو ارزاں بنا دیتا ہے۔ حکومت نے کشمیر پر سودا کیا۔ تب بھی اجتماعی خاموش رہی، کوئی آواز بلند نہ ہوئی، واجپائی کی آمد پر زبردست احتجاجی مظاہرہ کرنے والی جماعت اسلامی کے نعمت اللہ ناظم کراچی کی حیثیت سے بھارت کی کرکٹ ٹیم کا استقبال کر رہے تھے، پورے ملک میں کرکٹ ٹیم کا خیر مقدم ہوا،

ایک کنکر بھی نہیں پھینکا گیا، دوستی کا نعرہ وہ بھی لگا رہے تھے جو کل بھارتی وزیراعظم کی آمد گوارا نہ کرتے تھے۔ اسرائیل سے دوستی کو بھی جمہوری عمل نے ممکن بنا دیا ہے۔ ایم ایم اے کی خاموشی جمہوریت کا لازمی نتیجہ ہے کہ لوگ اپنا دین بھی بھول جاتے ہیں۔ یہی جمہوریت کا پھل ہے اسی شیریں پھل کے لیے امریکہ جمہوریت کی بات کرتا ہے۔ اسلام اور شریعت کے بجائے جمہوری نظام اور جمہوری عمل کا تحفظ ایم ایم کا مسئلہ ہے۔ اس کی خاطر آئین میں ترمیم کر کے پرویز مشرف کو وردی سمیت قبول کر لیا گیا۔ مختلف سمجھوتوں کے لیے اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے حزب اختلاف کے قائد کی کرسی بھی لے لی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حزب اختلاف میں بھی ان کا اعتبار قائم نہ ہوسکا۔ پرویز مشرف سے جمہوریت کی ضمانت لی گئی۔ شریعت نظام شریعت اور نفاذ شریعت کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا حتی کہ عام اخلاقی اقدار پر بھی مفاہمت کر لی گئی۔ رمضان میں ٹی وی جس بے باکی سے حمد اور نعت کو موسیقی کا رنگ دے کر شریعت کا مذاق اڑا رہا ہے اس پر بھی مجرمانہ خاموشی ہے۔ ٹی وی کا قبلہ تبدیل ہو گیا ہے۔ ملک کی نظریاتی سمت آن واحد میں تلپٹ کر دی گئی، کسی نے احتجاج کی آواز تک بلند نہ کی۔ جمہوریت کا پھل غیرت وحمیت کی آخری رمق بھی نچوڑ لیتا ہے، ایم ایم اے احتجاج کر رہی ہے کہ بلدیاتی انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ صوبہ سرحد بلوچستان میں دھاندلی کیا ایم ایم اے کی حکومتوں نے کرائی ہے وہاں ایم ایم اے کو شکست کیوں ہوئی؟ جن کے لہو نے اقتدار کا راستہ دکھایا تھا ان کے لہو کے قطروں نے اقتدار سے باہر نکالنے کا راستہ بھی دکھا دیا ہے۔ صوبہ سرحد میں زلزلہ اس اجتماعی غداری پر تنبیہ کی ایک شکل ہے، جس میں حزب اقتدار حکومت برابر کے شریک ہیں۔ مجاہدین کے لہو سے بے اعتنائی بہت مہنگا سودا ہے۔

مذہبی جماعتیں جب وردی کی مخالفت میں آگے بڑھیں تو بلدیاتی انتخابات میں شریک تمام علماء کو عدالت عظمٰی کے ذریعے نااہل قرار دے کر انتخابی عمل سے نکال باہر کیا گیا۔ کل تک درس نظامی کی سند ایم اے کے برابر تھی، آج میٹرک کے برابر بھی نہ رہی اور فیصلہ بھی نہایت عجلت میں کیا گیا۔ دینی جماعتیں خاموش رہیں، اس فیصلے کے ذریعے بتا دیا گیا کہ علماء جاہل ہیں، ان کی تعلیم جہالت ہے جسے قبول نہیں کیا جاسکتا، اہل دین کو اہل جہالت قرار دینے کا فیصلہ ایم ایم اے نے نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا، احتجاج کی ہمت بھی نہ ہوسکی۔ اتنے بڑے فیصلے پر ایم ایم اے کا ردعمل صرف یہ تھا کہ بس قومی اسمبلی کے اراکین کو نااہل قرار نہ دیا جائے اور اس فیصلے کا اطلاق صرف بلدیہ تک محدود رکھا جائے یا کم از کم قومی اسمبلی کے موجودہ اراکین کو اپنی معیاد پورا کرنے کا موقع دیا جائے۔ اقتدار اور حکومت جب اصل مقصود ہوں شریعت اور اللہ کی رضا ثانوی درجے میں ہوں تو یہ معاہدات کرنے پڑتے ہیں، جمہوری عمل کا کمال یہی ہے کہ ہر راسخ العقیدہ شخص اپنے عقیدے سے محروم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ورنہ اقتدار سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ جمہوریت میں یا عقیدہ رہ سکتا ہے یا اقتدار اور افسوس کہ ہماری

تمام دینی جماعتوں کو اقتدار ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے نے تہذیبوں کے تصادم کے فلسفے کی توثیق کر دی ہے اور بتا دیا ہے کہ سیکولر نظام سے فارغ التحصیل لوگ ہی تعلیم یافتہ ہیں، دینی مدارس سے فارغ التحصیل لوگ تعلیم یافتہ نہیں جاہل ہیں، حکومت وقت سے مصالحت کے ذریعے جو فوائد حاصل کیے جاتے ہیں ان کا نتیجہ یہی نکلتا ہے ضیاء الحق نے درس نظامی کو ایم اے کے مساوی قرار دیا۔ پرویز مشرف نے اسے میٹرک کے مساوی بھی تسلیم نہیں کیا۔ سہاروں پر تکیہ کا انجام یہی ہوتا ہے۔ ایم ایم اے نے قاضی حسین احمد کی دھمکی کے بعد متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ قومی سلامتی کونسل کے اجلاس میں سرحد کے وزیر اعلیٰ شرکت نہیں کریں گے لیکن وزیر اعلیٰ سرحد اس مشترکہ فیصلہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اجلاس میں شریک ہوئے۔ مسئلہ سرحد کی زلزلہ زدگان کی امداد کا تھا جو وزیر اعلیٰ کا حلقہ انتخاب ہے، سلامتی کونسل کے اجلاس میں عدم شرکت انھیں خطیر امداد سے محروم کر سکتی تھی لہٰذا انھوں نے جمہوریت کو ایم ایم اے پر ترجیح دی اور اپنے جمہور کے لیے مراعات طلب کرنے کے لیے اجلاس میں شریک ہوئے، جمہوریت کا خدا عوام ہیں عوام کے لیے ہر دینی اخلاقی قدر پامال کرنا جمہوریت کا ثمر ہے۔

مغرب اپنی جارح، ظالم، متشدد، مذہب دشمن فلسفہ اور تہذیب کو ان دو خوبصورت اصطلاحوں کی چلمن کے ذریعے اسلامی معاشروں میں غالب کرنا چاہتا ہے۔ دنیا میں جہاں بھی جمہوریت کو فروغ ہوا وہاں فحاشی عریانی عام ہوئے، جب فحاشی عریانی عام ہوتے ہیں تو خاندانی نظام مٹ جاتا ہے جو آزادی کا پہلا زینہ ہے۔ خاندان مٹنے کے نتیجے میں اجتماعیتیں ختم ہو جاتی ہیں اور انفرادی آزادی کے نام پر ہر فرد تنہا ہو کر سرمایہ دارانہ نظام میں بڑھوتری کا پرزہ بن جاتا ہے۔ تنہا فرد تنہائی دور کرنے کے لیے خراج مزاج کا مالک بن جاتا ہے۔ یہ مزاج جسے Consumerism کہتے ہیں سرمایہ داری کے پہیے کو رواں دواں رکھنے کا اصل سبب ہے۔ اجتماعی نظام میں شامل شخص بہت سی معاشرتی اور روایتی تہذیبی اقدار کے باعث خراج مزاج کا عیاش نہیں بن سکتا۔ دنیا میں سرمایہ داری جہاں بھی گئی اس نے اپنی معیشت معاشرت ثقافت کے ذریعے خاندانی نظام کو تہس نہس کیا، عریانی، فحاشی اس عمل کا لازمی نتیجہ ہیں، اس کے بغیر خاندانی نظام کی شکست و ریخت ممکن ہی نہیں ہے۔ جمہوری عمل میں شریک ہونے والا اپنی اقدار، روایات، رسوم و رواج، دینیات، الٰہیات سب کو رفتہ رفتہ اس طرح ترک کرتا ہے کہ خود اسے معلوم نہیں ہوتا۔ پاکستان کی مذہبی جماعتیں صرف گزشتہ پچاس سال کا جائزہ لیں تو انھیں اپنا سفر معکوس سفر نظر آئے گا۔ جماعت اسلامی نے روزنامہ تسنیم نکالا، اخبار میں جاندار کی تصویر شائع نہیں ہوتی تھی، تصویر کے بغیر اخبار نکال کر عظیم جہاد کیا گیا۔ [جب تصویر کی سہولت نہ تھی تب بھی بہت سے اخبار نکلتے تھے اور ان کا سکہ رائج الوقت تھا] ایک مرتبہ غلطی سے بلی کی تصویر شائع ہوگئی تو مرکز سے مدیر ارشاد احمد حقانی کی خبر لی گئی، صرف ۲۰ سال بعد مارچ ۱۹۷۰ء میں جسارت نکالا گیا تو تصویر کے ساتھ نکالا گیا۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا، سن دو ہزار تک جماعت اسلامی

خواتین کی سرگرمیوں کی تصاویر اخبارات میں شائع نہیں ہوتی تھیں، اب حال یہ ہے کہ دینی مدرسے ''المحصنات'' کے رسالے میں تصاویر شائع ہورہی ہیں، خواتین کی دینی درس گاہ میں لڑکیاں قاضی حسین کو گلدستے پیش کررہی ہیں، خواتین کے ساتھ نشست و برخاست ہورہی ہے۔ جامعہ کی خواتین غیر محرموں کو تحفے پیش کررہی ہیں، قاضی حسین خواتین کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو اور خطاب فرمارہے ہیں۔ ۱۹۹۵ء تک یہ ممکن نہ تھا، خواتین سے قاضی صاحب کا خطاب پردے کے پیچھے سے ہوتا تھا لیکن جدیدیت اور جمہوریت کا سفر دینی اقدار کو تحلیل کرتا ہے۔ ہر اگلا قدم کئی قدم آگے چلا جاتا ہے۔ یہ عمل نہایت اخلاص کے ساتھ اور سرعت کے ساتھ ہوتا ہے، اس سفر کی وجہ شدت اخلاص اور یہ تڑپ کہ کسی طریقے سے دین غالب ہو، لہٰذا مصلحت کے تحت بہت سے اصول عارضی طور پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، لیکن یہ مصلحت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ کل تک جو کچھ حرام تھا، رفتہ رفتہ حلال ہوتا چلا جاتا ہے، اب انہی لوگوں کو مولانا مودودیؒ کی کتاب ''پردہ'' سورہ نور اور سورہ سبا کی تفسیریں نظر نہیں آرہیں۔ ممکن ہے کہ تصویر کے مسئلے پر اجماع امت سے ہٹ کر جماعت اسلامی نے اجتہاد کیا ہو لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا، فتویٰ آج بھی حرام کا ہے لیکن عمل اس فتوے کے برعکس ہے، ابھی جماعت اسلامی کی قیادت اتنی جدیدیت پسند نہیں ہوسکتی کہ وہ مولانا مودودیؒ کی کتاب پردہ اور تفہیم القرآن سے سورہ نور، سورہ سباء کی تفسیر کو جماعت اسلامی کے نصاب سے خارج کردے اور رسائل و مسائل کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کردے جس میں پردے کے حوالے سے مولانا مودودیؒ نے واضح طور پر دین کا موقف بیان کیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ عجیب دین ہے جس کے احکامات ۱۹۵۰ء میں کچھ تھے ۱۹۷۰ء میں کچھ تھے اور ۲۰۰۵ء میں کچھ اور ہوگئے ہیں، دین زمان و مکان سے ماورا ہے۔ لہٰذا اپنی اصلاح کے بجائے دینی احکام کی اصلاح ہی جدیدیت ہے۔ دینی تحریکوں کے بعض رہنما فرماتے ہیں کہ مسئلہ تصویر میں انحراف کے بغیر کام نہیں چلتا ایسے تمام رہنماؤں کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ اسلام عہد حاضر کا ساتھ نہیں دے سکتا، مغرب آپ سے یہی عقیدہ اختیار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم میں غلبہ شریعت کا تقاضہ شریعت سے سہو نظر تھا۔ سورہ سباء کی تفسیر میں اور رسائل و مسائل میں مولانا مودودیؒ نے تصویر کے مسئلے پر دوٹوک مؤقف اختیار فرمایا، لیکن عملاً کیا اس موقف پر کوئی قائم ہے؟ کیا شریعت بدل سکتی ہے؟ کیا اجماع رد کیا جاسکتا ہے؟ اگر تصویر کے مسئلے پر مولانا مودودیؒ اور امت کی رائے غلط ہے تو یہ رائے تبدیل کی جائے ظاہر ہے امت کا اجماع غلط نہیں ہوسکتا۔ یہ زوال اور انحراف جمہوریت کا لازمی نتیجہ ہے، جمہوری عمل کے نتیجے میں تمام شرعی پابندیوں سے انحراف لازمی ہوتا ہے۔ بہ رضا و رغبت نہ سہی مجبوراً سہی پھر اضطرار کی یہ حالت دینی جماعتوں پر دائم طاری رہتی ہے اور اس کا دائرہ علماء کرام تک وسیع ہوجاتا ہے۔ اور مسئلہ تصویر اہم تمدنی مصالح میں شامل ہوجاتا ہے۔ حالات و زمانہ کی رعایتیں یہاں لاگو ہونے لگتی ہیں، دنیا میں ہر جگہ جمہوریت دینی اقدار کو اسی طرح مٹا دیتی ہے۔ دینی جماعتوں اور ایم ایم

اے کے غلط طرزِ عمل کے باوجود ہم نظریاتی طور پر ان جماعتوں کو درست سمجھتے ہیں اور تمام دینی جماعتوں سے امید رکھتے ہیں کہ یہی امت کی نگہبانی کریں گی لیکن اس امید کے ساتھ نقد و نظر اور جانچ پڑتال کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ ایم ایم اے اور دینی جماعتوں کو اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہے اگر یہ اندازہ ہو جائے تو وہ اقتدار کے ایوانوں میں رہنے اور مصالحت کی چادر اوڑھنے کی روایت ترک کر سکتی ہے۔ حالیہ تاریخ کے صرف دو واقعات دیکھے جا سکتے ہیں۔ پہلا واقعہ شناختی کارڈ سے مذہب کے خانے کا خاتمہ، دینی جماعتوں نے زبردست احتجاج کیا تو یہ فیصلہ واپس لے لیا گیا، گوجرانوالہ میں مردوں عورتوں کی مشترکہ دوڑ، اس دوڑ کے ذریعے استعماری منصوبے کے مطابق ملک کے تمام شہروں میں لذت آوارگی کو عام کرنے کا ارادہ تھا۔ ایم ایم اے اس پر خاموش تھی لیکن ایم ایم اے کے جواں سال رکن صوبائی اسمبلی حمید اللہ نے جرأت رندانہ نعرہ مستانہ اور ہمت مردانہ سے اس دوڑ کو ناکام بنانے کا اعلان کیا اور حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اگر یہ دوڑ کامیاب ہو جاتی تو ملک کے ہر شہر میں آوارگی کے مظاہرے عام ہوتے، مردوں عورتوں کے مشترکہ تیراکی کے مقابلے بھی ہوتے، پنجاب حکومت نے پورے پنجاب میں آوارگی کی اس مہم کی تیاری کر رکھی تھی لیکن گوجرانوالہ کے واقعے نے حکومت کے چھکے چھڑا دیئے۔ صدر پرویز مشرف نے آوارگی کے ان مظاہر سے لاتعلقی کا اعلان کیا اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغیات سے گفتگو کرتے ہوئے صاف لفظوں میں اعتراف کیا کہ ''مرکزی حکومت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ صوبائی حکومت کا منصوبہ تھا ہم سے نہیں پوچھا گیا، ابھی پاکستانی قوم اتنی روشن خیال نہیں ہوئی کہ وہ مردوں عورتوں کی مشترکہ دوڑ برداشت کر سکے۔ ہم رائے عامہ کو تبدیل کریں گے، دہشت گردی اور قدامت پرستی میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں قدامت پرستی ہے۔ ۲۵ مرد عورتوں کی دوڑ کو تحفظ دینے کے لیے تین سو پولیس والے نہیں لگائے جا سکتے۔ یہ ایک مضحکہ خیز صورت حال ہوگی۔'' پرویز مشرف کی یہ پسپائی بتاتی ہے کہ وہ دینی قوتوں سے کس قدر خائف ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ دینی قوتیں حکومت سے خائف ہیں اور اصولوں پر مسلسل اور مستقل سودے بازی میں مصروف ہیں۔ یہ رویہ اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس عذاب تنبیہہ انذار کی ایک شکل زلزلہ ہے اگر یہ زلزلہ ہمارے دینی قائدین کو ایمان کی جرات اور حرارت عطا نہ کر سکے تو اس ملک اور ملت کا اللہ حافظ ہے۔ جمہوری عمل میں شرکت کے ذریعے دینی جماعتیں رفتہ رفتہ اپنے نظریاتی دینی تشخص سے مسلسل بے گانہ ہو رہی ہیں اور جدیدیت ان کے دروازوں میں داخل ہو چکی ہے۔ تصویر کے مسئلے سے لے کر عورتوں کے دائرہ کار تک تمام دینی جماعتیں مسلسل پسپائی کے سفر میں ہیں کیونکہ جمہوری عمل میں شرکت کے نتیجے میں یہ نظریات کارآمد نہیں رہتے، لہٰذا جمہوریت کا اسیر اسلام کو اس راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے اور عمل سے اس کی شہادت دیتا ہے، اس کے تمام مذہبی نظریات رفتہ رفتہ بکھر جاتے ہیں۔ کوئی مدبر یہ مسئلہ نہیں اٹھاتا کہ اگر کسی عورت کے چھ بچے ہوں اور ہر بچے کی

ولادت دو سال کے وقفے سے ہو تو کیا یہ عورت ربع صدی تک بچوں کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو سکتی ہے، کیا اسلام میں عورت کا وہی دائرہ کار ہے جو مغربی معاشروں میں متعین کیا گیا ہے۔ اگر عورت مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرے تو خاندان کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش کس طرح ممکن ہوگی۔ یہ سیدھا سادا سوال ہے۔ قرآن نے واضح طور پر عورت اور مرد کی حدود کا تعین کر دیا ہے۔ جب حضرت مریم پیدا ہوئیں تو ان کی والدہ نے کیا کہا تھا ''لیس الذکر کالانثیٰ'' اس کا کیا مطلب ہے؟ قرآن نے بار بار جہاد سے بھاگنے والوں اور گھر میں بیٹھنے والوں کے لیے کیا کہا ''القعدین الخوالف' کی اصطلاحات کس طرح اشارہ کر رہی ہیں۔ عورتوں کو دو سال تک کامل دودھ پلانے کا حکم دیا گیا ہے کیا بازار میں نکلنے کے بعد عورت کے لیے اس حکم کی تعمیل ممکن رہتی ہے کیا اسلام اور مغرب کی عورت میں کوئی فرق نہیں ہے، کیا دونوں کا دائرہ کار یکساں ہے۔ اسلام اور مغرب میں عورت کے تصور کو مساوی سمجھنے کا موقف کھلی گمراہی، طغیان، قرآن وسنت سے انحراف اور اجماع کا انکار ہے۔ افسوس یہ ہے کہ بنیادی حقوق کی حمایت میں بات کرتے ہوئے اب کچھ علماء بھی اسی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ مغربی معاشروں میں عورتوں کی شمولیت کے لیے پہلے کم بچے اور اس کے بعد بچوں کی پیدائش ممنوع قرار پائی، جس معاشرے میں عورتیں بچے پیدا نہ کریں وہاں عورت ہر شعبہ زندگی میں حصہ لے سکتی لیکن اسلام میں نہیں۔ یہ درست ہے کہ جمہوریت کو مجبوری کے عالم میں ایک آلے کے طور پر وقتی مصلحت کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے مگر اسے تمام مسائل کا مداوا اور ہر درد کا درماں سمجھنا مغربی فکر وفلسفے سے قطعی ناواقفیت کا شاخسانہ ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہماری دینی جماعتیں اور عالم اسلام میں اجتماعی طور پر مغربی فکر وفلسفے پر غور وفکر کی روایت عام نہیں ہوئی جس کے باعث ہماری مخلص مذہبی تحریکیں مغرب کے اس جال سے نہیں نکل سکیں۔ جمہوریت اور آزادی کا طلسمی جال مذہبی تحریکوں، دینی جماعتوں اور انقلابی قوتوں کو بے بال وپر بنا رہا ہے۔ ان تحریکوں کے لیے وقت ہے کہ وہ یورپ میں سوشلسٹ جماعتوں کے انجام کا مطالعہ کریں جو جمہوری عمل میں شرکت کے نتیجے میں رفتہ رفتہ سوشلزم سے ہٹ گئیں اور سرمایہ دارانہ نظم اور تنظیم کا حصہ بن گئی۔ جمہوریت اور سرمایہ داری ہر قسم کی اجتماعیت کو تہس نہس کر دیتی ہیں۔ خواہ وہ خاندان ہو یا مذہب، جمہوریت نے پہلے عیسائیت اور کلیسا کو تباہ کیا پھر خاندان کو تہس نہس کیا، پھر رشتوں کو تباہ و برباد کیا، میاں بیوی عاشق معشوق بن گئے، اولاد بوجھ بن گئی، لہٰذا مغرب کی آبادی کی شرح منفی ہوگئی۔ اور آج یورپ میں سوشلسٹ تحریکیں سوشلسٹ جماعتیں حتی کہ مزدور تحریکیں، مزدور تنظیمیں سب دم توڑ چکی ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی جمہوریت ہر دین اور ہر نظریے کو لادین کر دینے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اجتماعیتوں کو پارہ پارہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت بھی اس کا اندازہ یورپ کی سیاسی اور مزدور تحریکوں کی تاریخ سے واقف لوگ بخوبی کر سکتے ہیں۔

نجی ٹی وی چینل نئی ثقافت کو فروغ دے رہے ہیں

علماء کرام کے نجی چینلوں سے تعاون کی شرعی حیثیت؟

قائداعظم یونیورسٹی کے تحت ہونے والے "Dialogue on television chennels:Creators of new social value" سے ٹیلیویژن سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات نے خطاب کیا۔ایک شخصیت نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکمرانوں کے مذہب کی طرح حاوی قوم کی تہذیب بھی دنیا بھر میں فروغ پاتی ہے۔انہوں نے کہا کہ ۱۹۹۰ میں نجی ٹی وی چینل کی آمد سے قبل تک پی ٹی وی کو گھریلو چینل ہونے کا فخر حاصل تھا،مگر وہ اب اپنے اس تشخص سے محروم ہو چکا ہے۔ٹی وی کی تشہیر کا ۸۳ فیصد بجٹ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پاس ہے،اور نجی چینلز کثیر الاقوامی کمپنیوں کی پسندیدہ ثقافت کو فروغ دے رہے ہیں۔جن کی ضرورت ایک ایسا بے حجاب معاشرہ ہے جہاں اجتماعیت ختم ہوگئی ہو،خواہش نفس خدا بن گئی ہو،عورت گھر سے باہر نکل گئی ہو،خاندان ٹوٹ گیا ہو،جس کے نتیجے میں صارفین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے اور کمپنیوں کی مصنوعات زیادہ سے زیادہ فروخت ہوسکیں،ایسے معاشرے جہاں خاندانی اجتماعیت مستحکم ہو،عورت بازار کی رونق نہ ہو اور زنا کاری جہاں عام نہ ہو،وہاں صارفین کی تعداد محدود رہتی ہے،لہٰذا سرمایہ داری کے پہیے کو چلانے کے لیے ضروری ہے کہ [Consumer Culture] خراچ ثقافت پیدا کی جائے،جس کا آسان ذریعہ ٹی وی ہے۔تمام نجی چینل سرمایہ داری کے خادم کے طور پر معاشرے میں فحاشی عام کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں خاندانی اجتماعیت کا شیرازہ تیزی سے بکھر رہا ہے۔خواہش نفس نے خدا کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور اسے پورا کرنے کا ذریعہ کمپنی کی منصوعات ہیں۔ایسا معاشرہ تعمیر کیا جا رہا ہے جہاں ان کی مصنوعات آسانی سے فروخت ہوسکیں۔انھوں نے کہا کہ یہ نجی چینلز سماجی اقدار سے متصادم چیزیں اپنے تجارتی مقاصد کے حصول کے لئے معاشرہ میں فروغ دے رہے ہیں۔یہ نجی چینلز صرف چکا چوند پر مبنی ثقافت گلیمر کو فروغ دے رہے ہیں۔

پی ٹی وی کی سابق خاتون جنرل مینجر نے کہا کے ٹی وی چینلز نے خواتین پر بڑھتے ہوئے تشدد کو روکنے کیلئے کچھ نہیں کیا بلکہ انھوں نے ہمیشہ عورت کو مال تجارت اور مارکیٹ کی شئے سمجھا ہے اور اب اس دوڑ میں پی ٹی وی بھی شریک ہو گیا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ یہ ایک سرکاری نشریاتی ادارہ ہے۔ جس کی ذمہ داری سماجی اقدار کی پاسداری ہے، انہوں کہا کہ اب یہ ذمہ داری شہری معاشرہ پر عائد ہوتی ہے کہ اب وہ اپنی سماجی اقدار کی حفاظت خود کرے۔ ایک اور شخصیت نے بتایا کہ میڈیا، گلیمر کے ذریعے لوگوں پر ایک نیا کلچر تھوپنا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خواتین ڈراموں کے پلاٹ کے بجائے اداکاروں کے لباس اور ان کے زیورات سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں خراج معیشت فروغ پاتی ہے، آمدنی سے زیادہ خرچ کے باعث عورتیں شوہروں پر دباؤ ڈال کر انھیں کریڈٹ کارڈ کے ذریعے قرض لینے پر اکساتی ہیں، گلی گلی بینک کریڈٹ کارڈ لے کر گھوم رہے ہیں کہ خدارا ہم سے قرض لے لو یہ تمہاری زندگی کے لیے ضروری ہے اس کے بغیر تمہاری گاڑی نہیں چل سکتی، خاندان قرضوں کی زنجیر میں جکڑے جا رہے ہیں۔ قرضوں کی ادائیگی بروقت نہ ہونے کے باعث سود کے مسائل نے نفسیاتی عوارض میں اضافہ کر دیا ہے۔ اے ٹی وی کے رضوان ممتاز نے کہا کہ کیبل ٹی وی کے پاس مارکیٹ کا ۲۰ فی صد حصہ ہے، جبکہ پی ٹی وی کے پاس ۸۰ فی صد مارکیٹ ہے۔ رضوان اظہر نے کہا کہ نجی چینلز کا مقصد صرف اور صرف پیسہ کمانا ہے اور اس کی خاطر وہ سماجی اقدار کی پاسداری کی حفاظت کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ تمام باتیں گہرے غور وخوض کی طلب گار ہیں خصوصاً علماء کرام جنھیں آج کل ٹی وی چینلوں پر شرکت کی دعوت عام ہے انھیں توقف فرما کر سوچنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ کیا نجی ٹی چینلوں سے تعاون طغیان عصیان سے تعاون نہیں ہے؟ ٹاک شو کے نام سے مختلف پر گروام میں متنوع لوگوں کو جمع کیا جاتا ہے، کسی عالم کو بھی بلایا جاتا ہے، گفتگو میں دینی اقدار کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ اسلام پر شدید حملے ہوتے ہیں، مغربی تہذیب وثقافت کی بھرپور وکالت ہوتی ہے، اسلامی اقدار، روایات، آیات واحادیث کا براہ راست مضحکہ کیا جاتا ہے، لیکن ہمارے علماء فلسفہ رواداری کے تحت مسکراتے ہیں اور پھر معذرت خواہانہ جوابات دے کر اعتراف شکست فرماتے ہیں۔ قرآن نے واضح الفاظ میں حکم دیا ہے کہ جہاں اللہ کی آیات سے تمسخر کیا جائے وہاں سے اٹھ جاؤ، نجی چینل مواصلاتی قحبہ خانوں اور عصمت فروشی کے اڈوں کے سوا کچھ نہیں جہاں عورت فروخت کی جا رہی ہے اسلامی اقدار وروایات ملیا میٹ ہو رہی ہیں، اسی لیے علماء کی اکثریت نے ہمیشہ ان چینل سے خاص فاصلہ رکھا اور جید علماء نے ٹی وی پر گفتگو کی دعوت ہمیشہ رد کی، علماء کی اکثریت اسے آلہ شر سمجھتی ہے اور اس سے دور رہتی ہے۔ ان کا موقف بالکل درست ہے کہ شر سے خیر برآمد نہیں کیا جا سکتا اور تجربات نے بتا دیا ہے کہ ٹی وی کے ذریعے دین کے غلبے کی بات احمقانہ تصور ہے اس کے باوجود بعض جید علماء کا نجی چینلوں سے تعاون مناسب نہیں ہے۔ کیا علماء کرام نے قحبہ خانے میں عفت وعصمت پر وعظ کی دعوت کبھی قبول کی ہے؟ اگر نہیں تو اب یہ دعوتیں کیوں قبول کی جا رہی ہیں۔

ایاز امیر، مسئلہ کشمیر اور زلزلہ

سول اینڈ ملٹری گزٹ پر قاتلانہ حملہ

۲۳ ستمبر ۲۰۰۵ء کے ڈان میں ایاز امیر نے کشمیر کے مسئلے پر ایک عجیب وغریب کالم لکھا:

If only that tough stance had lasted. It didn't. During the course of a Reuters' interview, Musharraf made the startling proposal that for the sake of flexibility Pakistan could go beyond the UN resolution on Kashmir. The wages of one-man rule: the entire basis of Pakistan's stand on Kashmir ditched or diluted through this single off-the-cuff remark.

One man says 'yes' to Colin Powell on the telephone post-Sep 11 without any institutional discussion of what Pakistan's negotiating position should be. When the Americans are preparing to invade Iraq they ask for Turkish cooperation, but the Turks, even though staunch American allies, put a stiff price on cooperation (eventually too steep for the Americans to accept).

This was the fourth time in the past one year that the Indian Prime Minister was being requested to visit Pakistan. Each

time the invitation is graciously accepted but no dates are set. Pakistan has never lowered itself so much to please India a string of unilateral concessions from the Jan 4, 2004, joint statement to the misguided offer of bypassing the UN resolutions for little in return.

Six years of unchecked power being enough to turn anyone's head.

کشمیر کے مسئلے پر پچاس سال کی محاذ آرائی اور خوں ریزی کے بعد لمحوں میں سودا گری کس قانونی قاعدے اور ضابطے کے تحت تھی؟۔لاکھوں کشمیریوں کو خاک وخون میں غلطاں پیچاں کرنے کے بعد امن کی فاختہ کیسے یاد آ گئی، پچاس سال تک اربوں کھربوں روپے خرچ کر کے بھارت سے دشمنی پالی گئی، عورتوں کی عزتیں برباد کرائی گئیں، ہزاروں مجاہدین کو خاک وخون میں تڑپایا گیا، اگر سودے بازی آج ہوسکتی، اگر معاہدہ ممکن تھا، اگر میز پر مسئلہ حل ہوسکتا تھا تو پچاس سال تک کشمیر کے چناروں کو کیوں جلنے دیا گیا لہو کے قطروں سے دنیا کو کیوں بے وقوف بنایا گیا صلح ہوسکتی تھی تو پہلے کیوں نہ ہوسکی؟ سودے بازی کی یہ تاریخ نئی نہیں پرانی ہے، اپریل ۱۹۴۹ء میں سول اینڈ ملٹری گزٹ نے خبر دی کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان ریاست جموں کشمیر کی تقسیم کے سمجھوتے کا فارمولا زیر بحث ہے اور جلد معاہدہ ہونے کی توقع ہے۔حکومت نے اس کی تردید کی لیکن اس خبر کی اشاعت کو غداری کا جرم قرار دیا گیا ۴۹ میں کشمیر پر معاہدے یا سمجھوتے کی خبر شائع کرنا جرم غداری تھا آج اس موضوع پر چپ رہنا، اس سے احتراز کرنا غداری ہے پچاس سال میں تاریخ بدل گئی ہے۔

[ضمیر نیازی اپنی کتاب ''صحافت پابند سلاسل'' میں ۱۹۴۹ء میں کشمیر پر میں سمجھوتے کی خبر دینے کو غداری قرار دینے کی داستان بیان کرتے ہیں آج سمجھوتے کرنے والے ملک کے وفادار کہلا رہے ہیں اگر یہ طرز عمل درست ہے تو حکومت سول اینڈ ملٹری گزٹ سے معافی طلب کرے۔]

''جناح کی وفات کے بمشکل نو مہینے بعد، اپریل ۱۹۴۹ء میں ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' نے اپنے نئی دہلی کے نمائندے، اے این کمار، کی ایک رپورٹ شائع کی جس سے اشارہ ملتا تھا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان ریاست جموں وکشمیر کی تقسیم کے سمجھوتے کا فارمولا زیرِ بحث ہے اور یہ کہ اس سلسلے میں جلد ہی ایک معاہدہ ہونے کی توقع ہے۔حکومت پاکستان نے فوری طور پر اس رپورٹ کی تردید کی۔اگلے روز ''گزٹ'' نے پہلے صفحے پر تردید شائع کی اور رپورٹ کے شائع کرنے پر معذرت کا اظہار کیا۔اخبار نے یہ بھی اعلان کیا کہ ذمے دار ذرائع

سے تصدیق کیے بغیر رپورٹ بھیجنے کی پاداش میں نئی دہلی کے نمائندے کو برطرف کر دیا گیا ہے۔لیکن ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے خلاف ''نوائے وقت'' کی قیادت میں ایک مہم شروع کر دی گئی جس میں بعد میں دوسرے اخبارات،حتیٰ کہ ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' بھی،شامل ہو گئے۔۶رمئی ۱۹۴۹ء کو مغربی پاکستان کے کم از کم سولہ روم ناموں (ایک حیران کن تعداد!) میں ایک مشترکہ اداریہ شائع ہوا (مشرقی پاکستان کے اخباروں نے اس کورس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا) جس میں ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے سر کا مطالبہ کیا گیا۔صرف ''امروز'' کے چراغ حسن حسرت نے یہ اداریہ شائع کرنے سے انکار کیا لیکن وہ اپنے انکار پر صرف چوبیس گھنٹے قائم رہ سکے۔ ''امروز'' میں یہ اداریہ اگلے روز، ۷مئی کو شائع ہوا۔اُسی دن ویسٹ پاکستان پریس ایڈوائزری کمیٹی نے بھی ایسا مطالبہ کیا۔مشترکہ اداریے اور ایڈوائزری کمیٹی کے مطالبے کا لبِ لباب یہ تھا کہ ''اخبار نے دیانت دارانہ صحافت کے بنیادی اصولوں کی سنگین خلاف ورزی کا ارتکاب کیا ہے۔''غداری'' کے عنوان سے شائع ہونے والے اداریے میں ایک قدم اور آگے جا کر کہا گیا تھا:

> پیشہ ورانہ بداطواری سے قطع نظر، مذکورہ اخبار نے، ہماری سوچی سمجھی رائے میں، ہماری ریاست سے غداری کے عمل کا ارتکاب کیا ہے......ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ گورنر مغربی پنجاب......کو ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے خلاف فوری طور پر تعزیری اقدام کرنا چاہیے اور ایک مناسب عرصے کے لیے اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دینی چاہیے۔اگر گورنر یہ کارروائی کرنے سے قاصر رہے،تو ہم مرکزی حکومت سے مداخلت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔اس کے پاس ایسا کرنے کے لیے اختیارات موجود ہیں۔

مشترکہ اداریہ مندرجہ ذیل اخباروں نے شائع کیا مدیروں کے نام قوسین میں دیے گئے ہیں:

کراچی اور لاہور کے روز نامے:

(۱)''ڈان''[الطاف حسین]، (۲)''ڈان گجراتی''[نور محمد جمال نور میمن]، (۳)''ڈان اردو''[فضل احمد صدیقی]، (۴)''جنگ''[میر خلیل الرحمٰن]، (۵)''انجام''[عمر فاروقی]، (۶)''سندھ آبزور''[پیر علی محمد راشدی]،(۷)''الوحید'' سندھی[عبدالغفور سنیائی]، (۸) ''پاکستان ٹائمز''[فیض احمد فیض]، (۹)''نوائے وقت''[حمید نظامی]، (۱۰)''امروز''[چراغ حسرت]، (۱۱)''زمیندار''[اختر علی خان]، (۱۲)''سفینہ''[وقار انبالوی]، (۱۳)''انقلاب''[مہر وسالک]، (۱۴)''غالب''[میر نور محمد]،

(۱۵) ''مغربی پاکستان''[خلیل احمد]، (۱۶)''جدید نظام''[امین الدین صحرائی]، مدیروں کے مطالبے کو ترجیح دی گئی اخبار چھ مہینے کے لیے بند ہوا اور پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جموں وکشمیر پر خفیہ مذاکرات ۱۹۴۹ء سے جاری ہیں لیکن سیاسی مقاصد کے لیے کشمیر کے مسئلے کو ایک آتش فشاں کے طور پر زندہ رکھا گیا اس کو زندہ رکھنے کے لیے مذہبی جماعتیں آلہ کار بنیں، جہادی تحریکوں کی ریاستی سرپرستی کی گئی۔اصولی طور پر اس مسئلے کو زندہ رہنا چاہیے تھا اور اس پر کسی قسم کے لین دین کی ضرورت نہ تھی لیکن خفیہ سفارت کاری کے ذریعے غداری کا ارتکاب ۱۹۴۹ء سے کیا جا رہا ہے اب اسرائیل سے تعلقات کے لیے بے تابی قابل دید ہے خفیہ رپورٹوں کے ذریعے بتایا جا رہا ہے کہ اسرائیل سے رابطے جنرل ضیاء الحق ،نواز شریف، بے نظیر دور میں مسلسل تھے خفیہ دورے بھی ہوتے تھے بس جرات مندانہ ہمت مردانہ اور نعرہ مستانہ کی کمی تھی یہ تینوں کمالات جنرل پرویز مشرف میں جمع ہو گئے ہیں لہٰذا امن کی فاختہ کا سفر تیز تر ہو گیا ہے اس بات سے قطع نظر کہ اسرائیل اور کشمیر کے مسئلے پر خفیہ سفارت کاری غداری ہے یا نہیں جرم تھا یا نہیں اصل سوال یہ ہے کہ صرف مذاکرات اور متوقع سمجھوتے کی خبر شائع کرنے والا اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ اس وقت غدار تھا تو سمجھوتے کرنے والوں کو غدار قرار دینے میں کیا امر مانع ہے پاکستانی اخبارات آج حکمرانوں کے خلاف مشترکہ اداریہ کیوں شائع نہیں کر رہے۔

جہاد کشمیر کے علمبردار کہاں ہیں، وہ جعلی مجاہد اول جس کا دعویٰ تھا کہ پہلی گولی میں نے چلائی اور آخری گولی تک جنگ کروں گا۔سری نگر میں مذاکرات میں کس طرح شریک ہے حزب اختلاف، اسلامی جماعتیں اس پورے عمل پر مہر بہ لب ہیں تمام جہادی تنظیموں کو اب جہاد یاد نہیں رہا۔

کشمیر میں پانچ لاکھ لوگوں کو شہید اور لاکھوں لوگوں کو زخمی کرانے کے بعد اقوام متحدہ کی قراردادوں کو ترک کر کے امن کا سمجھوتہ اگر کیا جا سکتا تھا تو ان لاکھوں کے شہیدوں کے خون کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اگر افہام و تفہیم سے معاہدہ ہو سکتا تھا اگر یہودیوں سے محبت بڑھائی جا سکتی تھی تو پچاس سال تک ہندوؤں سے محاذ آرائی کیوں جاری رکھی گئی، جہاد کے نام پر ہزاروں نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا، ان کے لہو کا سودا کرنے والے وفادار ہیں، لہو کا نذرانہ پیش کرنے والے غدار ہیں۔اتنے بڑے واقعے پر خاموشی مجرمانہ خاموشی تھی اور زلزلہ اسی غفلت، غداری اور جرم کی سزا بھی ہو سکتا ہے۔جہاد کے نام پر لاکھوں لوگوں کو شہید کرانے کے بعد جہاد سے انحراف دین سے انحراف ہے ناقابل معافی جرم، اس جرم میں مذہبی جماعتیں بھی شریک ہیں۔جب اجتماعی طور پر غداری کا ارتکاب کیا جائے تو زلزلہ کی یہ سزا بہت کم ہے۔کشمیر میں قیامت خیز زلزلہ اس بات کا اعلان بھی ہے کہ وہاں غداری پر کوئی احتجاج نہیں کیا گیا۔

فاشسٹ ملاّ: نئی مغربی اصطلاح

الجزائر میں فرنٹ کے ۱۳۸۵ ارکان اسمبلی ڈاکٹریٹ تھے

۱۲ ستمبر کو واشنگٹن ٹائمز نے تین قسطوں پر مشتمل ایک مضمون کی پہلی قسط شائع کی ہے جس کا عنوان ہے:"The West's Last chance: An Islamist Threat Like the Nazis"۔

مضمون کے ساتویں پیراگراف میں اسلامی خطرے کی پہلی مثال گزشتہ نومبر ہالینڈ میں فلمساز کا قتل ہے انھوں نے اسلامی ممالک میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے ''سلوک'' پر فلم بنائی تھی اسے کسی مسلمان نے قتل کر دیا۔ اسے ایک "Islamist" دہشت گرد قرار دیا گیا اس کے بعد اخبار نے لکھا ہے کہ ''روادار ہالینڈ میں اس واقعے کے خلاف جس غصے کا اظہار ہوا ہے اور جس میں مساجد کا جلایا جانا بھی شامل ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یورپی قوم کا "Instinct for Survival" ابھی تک مکمل طور پر بجھا نہیں ہے''۔

اخبار نے اسلامی فاشسٹ ملاّؤں پر الزام لگایا ہے کہ وہ اپنے نوجوانوں کو شراب پینے کی اجازت دیتے ہیں، داڑھی صاف کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور ایسے کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں جنھیں ایک مسلمان کے لیے گناہ سمجھا جائے گا یہ سب اس وقت تک اسلامی فاشسٹ ملاؤں کو قابل قبول ہے جب تک یہ نوجوان جہاد کو آگے بڑھاتے ہیں۔

اس پروپیگنڈے کا مقصد ہر طرح کے مسلمانوں کے خلاف نفرت اور شک پیدا کرنا ہے آپ اگر پابندی سے نماز پڑھتے ہیں اور مسجد جاتے ہیں اور داڑھی بھی رکھی ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ آپ انتہا پسند جہادی ہیں لیکن اگر آپ محض مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، ارکان دین کے پابند نہیں ہیں اور آپ میں پانچوں شرعی عیب ہیں تب بھی آپ کے بارے میں یہ شک پیدا کیا جائے گا کہ آپ دراصل جہادی ہیں اور یہ سب کام کرنے کی ''اجازت'' آپ کو کسی فاشسٹ ملاّ نے دی ہے۔ واشنگٹن میں ایک عیسائی فاشسٹ پادری ہیں ان کا اپنا ٹیلیویژن شو ہے جس پر ایک ماہ پہلے انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ Venezuela کے صدر کو قتل کر دیا جانا چاہیے یہ کوئی محاورتاً

نہیں کہا گیا تھا جیسے ہم بعض دفعہ کہتے ہیں کہ میرا بس چلے تو میں فلاں شخص کا گلا دبادوں۔موصوف نے کہا کہ امریکہ کے پاس دوسرے ممالک کے سربراہوں کو قتل کرنے کی صلاحیت ہے اور چوں کہ Venezuela کے صدر مسلمان انتہا پسندوں سے دوستی بڑھا رہے ہیں لہٰذا امریکہ کو چاہیے کہ انھیں قتل کردے، بڑی لے دی ہوئی آخر میں انھوں نے یہ وضاحت کی کہ انھوں نے یہ بیان Frustration میں دیا تھا؟ لیکن چوں کہ یہ شخص سفید فام عیسائی ہے لہٰذا واشنگٹن ٹائمز کے مضمون نگار کو اس کے بیان یا رویے میں عیسائی فاشزم نظر نہیں آئے گا۔

ان کو یہ شکایت ہے کہ مسلمان یورپی آبادیوں میں مدغم نہیں ہو رہے اور اپنی مذہبی اور ثقافتی شناخت برقرار رکھنے پر مُصر ہیں۔مضمون نگار کو خدشہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو نہ روکا گیا تو یورپی عوام قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں گے اور Vigilante بن جائیں گے۔ یہ اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو معاشرے میں ان کے نقطۂ نظر سے ہونے والی باتوں کو ختم کرنے کے لیے قانون ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر ایک مجرم کو قانون مجرم ثابت نہیں کرسکتا تو یہ لوگ اسے قتل کر کے اسے اس کے جرم کی سزا دے دیتے ہیں۔

الجزائر کی مثال ہمارے سامنے ہے وہاں الیکشن میں منتخب ہونے والے ۳۸۵ اراکین کے پاس ڈاکٹریٹ تھی اور یہ اسلامیات یا جہاد کے موضوع پر نہیں تھی نہ ان لوگوں نے کسی مغربی ملک میں دہشت گردی کی تھی نہ اس وقت امریکی سفارت خانوں پر حملے ہوئے تھے نہ طالبان افغانستان میں گئے تھے اور نہ ہی ۱۱ر ستمبر کا واقعہ ہوا تھا لیکن پھر بھی اس ملک کی فوج نے امریکہ اور مغربی طاقتوں کے اشارے پر سیاسی نظام پر قبضہ کرلیا جواب بھی جاری ہے اور مغربی پریس میں اس کا ذکر تک نہیں ہوتا۔مغرب نے نجم الدین اربکان جیسے لبرل مسلم کو بھی برداشت نہیں کیا جب کہ اربکان کا اسلام ثقافتی اسلام تھا، ترک فوج نے اربکا کو افطاری کی دعوت دی اور بیگم کے ساتھ مدعو کیا، شرط یہ تھی کہ بیگم صاحبہ حجاب استعمال نہ کریں، اربکان نے بیگم کے بغیر دعوت میں شرکت سے انکار کردیا۔اربکان کی داڑھی بھی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اربکان کو برداشت نہیں کیا گیا۔آسٹریلیا کے وزیراعظم اور وزیر تعلیم نے تو صاف الفاظ میں اعلان کردیا ہے کہ جو مسلم بھی اپنی اقدار و روایات دین شریعت کو آسٹریلیا کی سیکولر اقدار سے بہتر اور برتر سمجھتا ہے وہ فوری طور پر آسٹریلیا خالی کردے، اس کے لیے آسٹریلیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔یہی تہذیبوں کا تصادم ہے، بوسنیا کے مسلمان صرف نام کے مسلمان تھے انھیں کلمہ بھی نہیں آتا تھا، وہ قبرستان میں فاتحہ پڑھنے کے بجائے پیانو بجا کر اپنے رب کے حضور مناجات پیش کرتے تھے۔ یہ آزادی بھی بوسنیا کے لبرل مسلمانوں کو زندگی مہیا نہ کرسکی، چاروں طرف سے گھیرے گئے اور مارے گئے، افسوس یہ تمام سبق دیکھنے کے باوجود مسلمانوں کی آنکھیں بند ہیں۔

جدیدیت آتی ہے تو فحاشی کا طوفان بھی لاتی ہے

روشن خیالی کا نتیجہ جرائم میں زبردست اضافہ

جدیدیت پسندی کا گڑھ.....کراچی جرائم میں سب سے آگے

سن دو ہزار سے پاکستان جدیدیت، روشن خیالی کا سفر کر رہا ہے۔ یہ نیا امریکی ایجنڈا ہے۔ افطاری کے وقت بھی موسیقی کے پروگرام نشر کر کے پاکستان کی جدیدیت کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ پوری قوم صرف ٹیلی فون خریدنے اور کرنے میں مصروف ہے یا گاڑیاں خرید رہی ہے اور قرضے لے رہی ہے، لڑکوں کے پائنچے ایڑیوں سے نیچے چلے گئے ہیں، لڑکیوں کے پائنچے اوپر اٹھتے جا رہے ہیں، یہ تہذیب حاضر کی جلوہ گری ہے۔ شہر کے امیر علاقوں میں نوجوانوں کی حالت قابل دید ہے۔ روشن خیالی کے اس سفر نے جرائم کی تعداد میں زبردست اضافہ کیا ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں جمہوریت یا سرمایہ داری آئی وہاں جنسی جرائم، عریانی، فحاشی عام ہوئی، رشتوں کا احترام ختم ہوا، روشن خیالی کے اس سفر کی چار سالہ روداد خون کے آنسو رلانے کے لیے کافی ہے۔

☆ ۲۰۰۰ء میں ملک بھر سے ۳۵۷ بچے اغواء ہوئے ۲۰۰۴ء میں یہ تعداد ۱۱۵۷ ہوگئی۔

☆ ۲۰۰۰ء میں ۱۳۰ بچے قتل ہوئے ۲۰۰۴ء میں تعداد ۷۶۶ ہوگئی۔

☆ ۲۰۰۰ء میں ۱۹۳ بچیاں جنسی درندگی کا نشانہ بنیں ۲۰۰۴ء میں یہ تعداد ۳۱۱ ہوگئی۔

☆ ۲۰۰۰ء میں ۱۹۲ لڑکے جنسی زیادتی کا شکار ہوئے ۲۰۰۴ء میں یہ تعداد ۲۳۱ ہوگئی۔

☆ ۲۰۰۰ء میں ملک بھر میں ۴۶ بچوں کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا ۲۰۰۴ء میں یہ تعداد ۲۹۸ ہوگئی۔

☆ ۲۰۰۰ء میں ۵۲۷ بچے گم ہوئے ۲۰۰۴ء میں یہ تعداد ۱۳۰۱ ہوگئی۔

☆ ۲۰۰۰ء میں ملک بھر میں ۱۲۷ بچوں نے خودکشی کی ۲۰۰۴ء میں یہ تعداد ۳۹۳ ہوگئی۔

☆ ۲۰۰۰ء میں ملک بھر میں بچوں کے خلاف جرائم کے ۱۶۱۲ واقعات رپورٹ ہوئے جو ۲۰۰۴ء میں بڑھ

کر ۴۵۳۰ ہو گئے۔[روزنامہ جنگل ۲۳ ستمبر ۲۰۰۵ء] ۲۰۰۵ء میں سول ہسپتال کراچی میں جنسی تشدد سے متاثر تین سو بچے لائے گئے، ۲۰۰۵ء میں کراچی میں بچوں پر تشدد کے واقعات میں اکیس فیصد اضافہ ہوا ہے۔ یہ اس شہر کا حال ہے جو سب سے زیادہ خوش حال، ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ اور جمہوریت کا مرکز ہے۔ مغرب کے تمام شہروں کا حال بھی ایسا ہی ہے بلکہ اس سے بدتر، اس سلسلے میں اعداد و شمار ہمارے گزشتہ شماروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

چار سالہ روشن خیالی کے دور میں پرائیویٹ ٹی وی چینل کھولے گئے اور کوٹھے کی ثقافت آزادی کے نام پر گھر گھر پہنچا دی گئی۔ اس ثقافت کے عام ہونے کا نتیجہ رشتوں کی پامالی کی صورت میں نکلا، رشتوں کا احترام ختم ہو گیا، حیاء رخصت ہو گئی، رسول اللہؐ نے درست فرمایا تھا کہ جب حیاء اٹھ جائے تو پھر آدمی جو چاہے کرے۔ حیاء ختم کرنے کا منظم طریقہ حکومت کی سرپرستی میں پرائیویٹ ٹی چینلوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جن کے سامنے جنسی آزادی کے سوا کوئی ایجنڈہ نہیں ہے۔ کیوں کہ ان چینلوں کو نوے فیصد اشتہار کثیر الاقوامی کمپنیوں سے ملتے ہیں اور ملٹی نیشنل کی مصنوعات اسی وقت زیادہ فروخت ہو سکتی ہیں جب صارفین کی تعداد زیادہ ہو، صارفین کی تعداد میں اضافہ خاندان کی شکست و ریخت سے ہی ممکن ہے جو آزادی کے نام پر برپا کیا جاتا ہے۔ فحاشی، عریانی، جنسی آزادی سے خاندان کی اجتماعیت پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور صارفین بڑی تعداد میں میسر آتے ہیں۔

گزشتہ چار سالوں میں اپنے عزیزوں کے ہاتھوں درندگی کا نشانہ بننے والے بچوں اور بچیوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ انھیں بچپن میں جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ عمل کرنے والے ان کے چچا، ماموں، تایا وغیرہ اور کہیں کہیں خود ان کے باپ تھے۔ جن لڑکیوں کے ساتھ یہ ظلم ہوا انھوں نے بتایا کہ انھیں زندگی میں سنگین مسائل کا سامنا ہے۔ ان سب میں ناامیدی، زندگی سے بے زاری اور خودکشی کے جذبات شدید تھے۔ کراچی میں ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق ۸۸ فیصد بچوں کو کسی نہ کسی قسم کے تشدد کا سامنا ہے۔ کراچی میں جنسی آوارگی، فحاشی، عریانی کا رقص سب سے زیادہ ہے کیونکہ کراچی سب سے زیادہ آزاد خیال، روشن خیال جدیدیت کا حامل شہر ہے۔ اس شہر کے بعض دینی اصحاب بھی جدیدیت کی رو میں بہہ رہے ہیں اور سود کو اسلامی جواز عطا کر رہے ہیں دین میں نئی رعایتیں اور نئی بدعتیں نکالی جا رہی ہیں تاکہ مغرب کو خوش کیا جا سکے جس شہر میں زیادہ جمہوریت، زیادہ آزادی، زیادہ روشن خیالی ہوتی ہے وہاں جرائم کی شرح بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ گزشتہ پانچ برسوں میں پورے ملک میں جتنے جرائم ہوئے ان کا زیادہ حصہ کراچی میں وقوع پذیر ہوا۔ جنگ کی رپورٹ کے مطابق:

گذشتہ ۵ برسوں میں ملک بھر میں بچوں کے تشدد کے کم از کم ۱۲۲۷ واقعات ہوئے۔ جن میں سے

۱۷۵۵ بچوں کو قتل کیا گیا، ان بچوں میں ۳۵۷ بچے کراچی سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۴۳۱ بچیوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا جن میں سے ۱۱۲۷ بچیوں کا تعلق کراچی سے ثابت ہوا ہے۔ لڑکوں سے بدفعلی کے ۱۳۰۰ واقعات ہوئے ان واقعات میں سے ۱۰۰ کراچی میں ہوئے۔ ملک بھر میں ۱۲۱۸ بچوں کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا جن میں سے ۲۳۲ بچے کراچی کے تھے۔ اس عرصے میں بچوں کی گم شدگی کے ۴۳۴۶ واقعات ہوئے جن میں کراچی کے ۱۱۲۷ بچے شامل تھے ۴۰۸۸ بچوں کو اغوا کیا گیا جن میں سے ۱۱۲۷ بچے کراچی سے اغوا ہوئے۔ ۱۶۱۸ بچوں نے خودکشی کی، خود کشی کرنے والے بچوں میں سے ۳۲۳ کراچی کے تھے ملک بھر میں اس عرصے کے دوران ۲۶۶ بچے غیر قانونی طور پر ملک سے باہر بھجوائے گئے ان بچوں میں ۶۷ بچے کراچی سے تعلق رکھتے تھے۔ [جمعہ ۲۳ ستمبر ۲۰۰۵ء جنگ کراچی]

عبدالستار ایدھی نے بتایا کہ کراچی میں روزانہ پچاس بوڑھوں کو ایدھی اولڈ ہوم میں جمع کرایا جاتا ہے۔ ماں باپ اولاد پر بوجھ بن گئے ہیں، درندگی اس درجے تک پہنچ گئی ہے کہ کراچی میں ایک شوہر نے ٹی وی پر گندے اور ننگے پروگرام دیکھنے کے بعد شدت جذبات سے مغلوب ہوکر اپنی چار سالہ سالی سے بدکاری کی، اس کی آنکھوں اور اعضاء نازک کو زخمی کیا اور اسے پہاڑی سے گرا کر ہلاک کر دیا۔ این جی اوز نے اس مسئلے کا حل یہ پیش کیا ہے کہ بچیوں کو جنسی تعلیم دی جائے۔ تاکہ وہ اپنا تحفظ کرسکیں ان نادانوں کو یہ نہیں معلوم کہ ایک بارہ پندرہ بیس سال کی بچی اپنے باپ، ماموں، چچا سے کس طرح بچ سکتی ہے۔ تحفظ تعلیم سے نہیں دین اور ایمان سے ملتا ہے جو لوگوں میں جذبہ حیاء کی آبیاری کرتا ہے تعلیم تو جنسی لذت کو محفوظ طریقوں سے حاصل کرنے کے حرام طریقوں کو آسان کر دیتی ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات کی پروفیسر نے بھی تجویز کیا ہے کہ بچیوں کو جنسی تعلیم دی جائے۔ پروفیسر صاحبہ سے سوال کیا جائے کہ ایک چار سالہ بچی کو کیا جنسی تعلیم دی جاسکتی ہے؟ بچی کی عمر اس تعلیم کی متحمل ہی نہیں، یہ تعلیم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ فکر آخرت سے محرومی کا مسئلہ ہے، لوگ آخرت کو بھول گئے ہیں، نئے چینل آخرت کو بھلانے کے تمام لوازمات مہیا کر رہے ہیں۔ اگر تعلیم دے دی جائے تب بھی ایک بیٹی اپنے باپ، بھائی، خالو، ماموں سے کیسے بچ سکتی ہے؟ اگر بچیوں کو ان کے اپنے گھر میں ان کے خونی رشتوں سے خطرہ ہو تو پھر دنیا ان کے لیے سب سے زیادہ غیر محفوظ جگہ ہے، یہ وقت اگر آ گیا ہے تو توبہ کی جائے یا عذاب کی دعا کی جائے یا قیامت کا انتظار کیا جائے اس انتظار کی بھی کیا ضرورت ہے یہ وقت اگر قیامت کا وقت نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ پھر دارالامان، این جی اوز کے قائم کردہ ادارے ان کو تحفظ نہیں دے سکتے، یہ ادارے تو عدم اطمینان پھیلانے کے ادارے ہیں، جب معاشرے میں باپ، خالو، چچا اپنی بچیوں سے ہوس پوری کریں تو معاشرے کے دوسرے مرد ان بچیوں کی حفاظت نہیں کرسکتے۔ سوائے خوف خدا کے وہ کونسی طاقت یا ایجنسی ہے جو بچوں کو تحفظ دے سکے؟

مدارس بینکوں کی حرام نوکری کے لیے علماء تیار نہیں کرتے

سولہ سال کی دینی تعلیم اور بینکوں کی حرام نوکری!

طلبہ بینک میں ملازمت کریں نعوذ باللہ

ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

[جامعہ بنوری ٹاؤن کے رئیس ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب نے ختم بخاری کی تقریب سے بصیرت افروز خطاب فرماتے ہوئے بعض علماء، دینی مدارس کی جانب سے بینکوں کی نوکری کی ترغیب وتائید پر مبنی تجدد، اجتہاد کی بالواسطہ مذمت کرتے ہوئے دینی مدارس کے طلباء پر واضح فرمایا کہ بینک خواہ کسی قسم کے ہوں ان کی نوکری حرام ہے۔ اسلامی بینک کاری کے ضمن میں عموماً کہا جارہا ہے کہ علماء نے اسے حلال قرار دیا ہے درست نہیں۔ پاکستانی اور ہندوستانی علماء کی اکثریت اسے حرام سمجھتی ہے۔ جسٹس تقی عثمانی صاحب بھی بعض تجربات و مشاہدات کے بعد اسی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں لیکن اظہار میں تامل ہے۔ لاہور میں اسلامی بینک کاری کے ناقدین پر نقد کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ ''اس کے مخالفین بھی کم از کم اسلامی بینکاری کو صریحاً حرام تو نہیں کہہ سکتے''۔ یہ جملہ بتاتا ہے کہ اگر صریحاً حرام نہیں تو صریحاً حلال بھی نہیں ہے اور جس چیز میں شک کا عنصر زیادہ ہو جائے۔ شریعت اسے ترک کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسلامی بینکاری کے تمام اصول قواعد سودی بینکاری کے مماثل ہیں۔ یہ متبادل معاملہ نہیں ہے۔ اسلامی بینکاری کا تمام کاروبار اب تیزی سے غیر مسلم بلکہ یہودی بینکوں کے پاس جارہا ہے۔ سود کو حلال ٹھہرانے کا دینی فریضہ انجام دینے کے بعد کفار کے لیے اب مسلم امت کے کھربوں روپے سے فائدہ اٹھانا آسان ہوگیا ہے۔ کنایہ میں گفتگو کرتے ہوئے مولانا اسکندر کے مخاطب حضرت مولانا تقی عثمانی ہیں جنھوں نے اسلامی بینک کاری کو حلال قرار دیا ہے اور آج کل مدارس کے علماء کو سودی بینکوں کے مشیران کے طور پر تیار کرارہے ہیں۔ یہ بصیرت افروز خطاب بینات، اکتوبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہو چکا ہے] میں آپ سے پوچھتا ہوں

تم جا کر میڈیکل کالج میں وہاں کے پرنسپل سے کہو، پرنسپل صاحب! آپ اس کالج میں انجینئرنگ کے مضمون کیوں نہیں رکھتے؟ آپ لاء کے مضمون کیوں نہیں رکھتے؟ آپ سائنس کے مضامین کیوں نہیں رکھتے؟ اگر وہ کوئی بڑی شخصیت ہے تو بڑے ادب سے کہے گا کہ: حضرت! ہم نے یہ میڈیکل کالج اس لیے بنایا ہے کہ یہاں اچھے ڈاکٹر پیدا کریں اور اچھے ڈاکٹر پیدا کرنے کے لیے جو نصاب ہوگا وہی ہم رکھیں گے۔ ہم نے یہ میڈیکل کالج اس لیے نہیں بنایا کہ ہم آپ کو سائنسدان دیں، علماء دیں یا انجینئر دیں۔ اور اگر کوئی عام آدمی جا کر پرنسپل کو کہے تو وہ کہے گا اس کو پاگل خانہ لے جاؤ۔ اب تم بتاؤ، دین کے معاملے میں یہ ہمیں کہتے ہیں کہ اس میں سائنس بھی رکھو، اس میں فلاں بھی رکھو، فلاں بھی رکھو، بھائی ہم نے تو یہ مدرسے اس لیے کھولے ہیں تاکہ ان میں علوم نبوی کے حامل علماء پیدا ہوں، اس لیے نہیں کہ یہاں سے اکاؤنٹنٹ یا انجینئر وغیرہ پیدا ہوں۔ پھر یہ کتنی جاہلانہ اور غلط مثال دی جاتی ہے کہ یہاں سے جو نکلے اس کو بینکوں میں نوکری مل جائے (نعوذ باللہ من ذلک) کتنی بے شرمی اور بے عقلی کی بات ہے، کیا کوئی طالب علم سولہ سال دینی تعلیم اس لیے پڑھتا ہے کہ وہ حرام کی نوکری جا کر کرے؟ پھر یہ علم ہم اس لیے تو حاصل نہیں کرتے کہ ہم نوکریاں کریں گے، علم حاصل کرنے والا تو اس لیے یہ علم حاصل کرتا ہے کہ وہ خود بھی عمل کرے اور دوسروں سے عمل کرائے اور امت کی رہنمائی کرے، یہ ہے اصل کام۔ ہمارے اسلامی دور میں جب بغداد میں بڑے بڑے مدرسے تھے، وہاں کے حکمران خود بھی بڑے علماء ہوتے تھے، وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اس دین کو پڑھائیں۔ اس دور کے ایک حکمران نے ایک رات حلیہ بدل کر چکر لگایا کہ دیکھیں طلبہ کیا پڑھ رہے ہیں؟ اس رات وہ چکر لگا رہا ہے اور ہر طالب علم کے پاس جا کر پوچھتا ہے کیوں پڑھ رہے ہو؟ کوئی کہتا میں بڑا قاضی بنوں گا، کوئی کہتا ہے جج بنوں گا، کسی نے کہا میں خطیب بنوں گا، حالانکہ انھوں نے ان مناصب کا نام لیا جو دینی منصب ہیں، اب یہ بے چارہ دل میں سوچتا ہے کہ بھائی ایسے مدرسہ کو تو بند کرنا چاہیے، ان کا مقصد تو خالص دنیا ہے، تنخواہیں ہے، وہ حکمران بددل ہو گیا، نکلتے نکلتے دیکھا کہ ایک صوفی سا طالب علم بیٹھا پڑھ رہا ہے، اس نے سوچا چلو بھائی اس سے بھی پوچھ لو۔ اس کے پاس جا کر کہا السلام علیکم! بھائی آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟ کیوں پڑھ رہے ہیں؟ طالب علم نے پہلے تو سلام کا جواب دیا پھر کہا: جناب اس لیے پڑھ رہا ہوں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے احکام نازل کیے ہیں، اپنی کتاب اور سنت رسول اللہ کی صورت میں، میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے ذمہ اللہ نے کیا فرائض عائد کیے ہیں، تاکہ میں ان کو بجالاؤں اور کن چیزوں سے مجھے روکا ہے ان چیزوں سے میں رک جاؤں، اس لیے پڑھتا ہوں۔ وہ حاکم ایک دم چونکا اور اس کی ساری رائے بدل گئی اس نے کہا جس ادارے میں اس جیسا ایک طالب علم بھی ہے اس ادارے کو بند نہیں کرنا چاہیے، دیکھیے اس دور کے مسلمان حکمران تو دینی مناصب کی غرض سے پڑھنے پر بھی خوش نہیں ہو رہے اور آج ہمیں کہا جا رہا ہے کہ یہاں سے طلبہ نکلیں اور بینک میں ملازمت کریں (نعوذ باللہ) کوئی سمجھ کی بات کرو۔

اسلامی بینک کے مشیر کا معاوضہ: پچاس ہزار پاؤنڈ سالانہ

اسلامی بنکاری ماہرین کا ہی کمال ہے

جسٹس تقی عثمانی ۸ بینکوں کے مشیر ہیں

مغربی بینکوں کی اسلامی سرمایہ کاری

نیوز ویک کے OWEN MATHEWS کی رپورٹ

آپ وہ پرہیز گار مسلمان ہیں جن کے پاس سرمایہ کاری کے لیے کچھ ملین پیٹرو ڈالر ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ اپنی رقم کو کسی منافع بخش کام میں لگائیں لیکن قرآن آپ کو منافع پر ادھار دینے سے منع کرتا ہے یا آپ کو غیر اسلامی مالی سرگرمیاں شروع کرنے سے بھی روکتا ہے مثلاً جوا، تمباکو فروشی یا سور کے گوشت سے بنی چیز وں کی فروخت وغیرہ سے روکتا ہے، تو کیا Abnamro, HSBC, Citi Group آپ کے لیے ایک مکمل اسلامی بینک ثابت ہوسکتا ہے؟ City اور کم از کم دس دیگر بڑے مغربی بینکوں نے اپنے سب سے بڑے مقامی حریف بحرین کے البرکہ کو جس کا سرمایہ نصف بلین ڈالر سے زیادہ ہے، پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ دنیا بھر میں شریعت سے ہم آہنگ بینک ڈپازٹ ۲۶۵ بلین ڈالر سے بھی زیادہ ہیں جیسا کہ اسلامی بینکاری اور مالیاتی رسائل وتحقیقی جرائد کا تخمینہ ہے۔

اسلامی بینکوں کے کاروبار پر مغربی بینکوں کا قبضہ:

شارجہ اسلامی بینک کے مطابق اسلامی بنکاری میں سرمایہ کاری گذشتہ سال کے مقابلے میں ۱۷ فیصد سے زیادہ ہے اور گذشتہ دہائی کی نسبت ۱۰ گنا زیادہ ہے سٹی بینک اور Abnamro کے علاوہ دس مغربی بینکوں نے اسلامی بنکاری کے نام پر شروع ہونے والی سرمایہ داری کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کرلیا ہے سٹی بینک کے یہاں اسلامی سرمایہ ۶ بلین ڈالر سے تجاوز کر گیا ہے مسلمانوں کے بنک البرکہ کو دس مغربی بینکوں نے شکست دے دی ہے

اوراب مسلمانوں کا سرمایہ تیزی سے اسلام کے نام پر مغربی بینکوں میں جمع ہورہا ہے۔ کیسے یہ ممکن ہوا کہ مغربی بینک اُس مارکیٹ میں چھاگئے جہاں اسلامی تقدس کو کافی اہمیت حاصل تھی؟ ایک نسل پہلے اسلامی بینک محض ایک انوسٹ منٹ ہاؤس تھا جوڈپازٹ پر سود دینے کے بجائے پراپرٹی خرید کر کرایہ پر دے دیتا تھا اور منافع پیدا کیا کرتا تھا۔[اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں میں مغربی ذہنیت، جدیدیت سے مرعوبیت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا پیدا ہونا ہے جس کا مقصد صرف دولت کا حصول ہے اور زر سے زر کمانا ہے]۔

اسلامی بینکاری: شرعی ماہرین کا کمال:

ہر شرعی ماہر ۵۰ ہزار پاؤنڈ معاوضہ لیتا ہے:

مغربی بینکوں نے اپنے یہاں شریعت کے ماہرین کی با معاوضہ خدمات حاصل کر کے اسلامی ساکھ حاصل کر لی ہے۔لندن میں شریعت پر عمل درآمد کے ماہر دانشور داؤد مجید کا کہنا ہے کہ ان اسلامی ماہرین کا ہی کمال ہے جس کی بنیاد پر ان بینکوں کے مالی منصوبے فروخت ہوتے ہیں۔اس لیے کہ مالیات سے متعلق اسلامی ماہرین کی تعداد مارکیٹ میں بہت کم ہے اور ان میں سے بیشتر ماہرین بیک وقت کئی ایک مالیاتی اداروں سے وابستہ ہیں۔انہیں ہر ایک بینک سے تقریباً سالانہ ۵۰ ہزار پاؤنڈ معاوضہ ملتا ہے۔شیخ محمد تقی عثمانی جو کہ سپریم کورٹ پاکستان شریعت بنچ کے ایک سابق جج ہیں، HSBC, Citi Islamic البرکہ بینک اور ۸ دیگر بینکوں کے بورڈ میں بیٹھتے ہیں اور Dow Jones Islamic Indvas کے شریعت پینل کے چیئرمین ہیں۔

اسلامی بینکوں کی ناقص کارکردگی:

مسلم ممالک میں ان کے اپنے بینکوں پر بے اعتمادی نے لوگوں کو مغربی بینکوں سے رجوع کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ظاہر ہے اس کی وجہ ان کے اپنے بینکوں کی واضح ناکامی ہے۔مثلاً ۲۰۰۱ء میں ترکی کے Ilhas Finance کی ناکامی اور شمالی قبرص کے Bank of Credit & Commerce International کی ناکامی نے کھاتے داروں کے اعتماد کو بری طرح مجروح کیا۔اسلامی دنیا کی سب سے بڑی معیشت کے حامل ملک ترکی میں ڈگمگاتا ہوا اسلامی بینکنگ کا سیکٹر ۳۶۰۰۰ ڈالر کے ڈپازٹس ضمانت کے لیے حکومت کو آمادہ کرنے کی کوشش میں ہے۔ملیشیا میں جہاں گیارہ فیصد سے زیادہ کھاتے دار اس وقت شریعت کے مطابق ہیں، مقامی مالیاتی ادارے مثلاً Bank Muamlaat ملٹی نیشنلز کی برابری میں آنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ایک اسلامی ماہر اقتصادیات ہمایوں درکا کہنا ہے کہ مقامی اسلامی بینکس میں جدید وسائل کا فقدان ہے اور کھاتے دار کسی بین الاقوامی نام کے ساتھ اطمینان محسوس کرتے ہیں۔

(بشکریہ: امریکی ہفت روزہ ''نیوز ویک''۔شمارہ۔۱۸ اگست ۲۰۰۵ء)

اسلامی بینکاری۔اصلاً سودی بینکاری ہے

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی

[ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی مالیات اور بینکاری کے حوالے سے دنیا بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں اسلامی بینک کاری کے تمام قومی و عالمی منصوبوں پر ان کی گہری نظر ہے سودی بینک کاری کا نام بدل کر اسلامی بینکاری کے تجربے میں درپیش خطرناک مسائل کی نشان دہی ڈاکٹر صدیقی نے ۴/اکتوبر کو ایک مضمون میں کی لیکن جسٹس تقی عثمانی صاحب اس مضمون کا جواب نہیں دے سکے جسٹس تقی عثمانی صاحب کے سابق مشیر ڈاکٹر حسن الزماں جو اسلامی بینکاری کے تجربے سے تائب ہو چکے ہیں ان کے خیال میں ''سود کا بھوت اسلامی بینکوں کا بدستور پیچھا کر رہا ہے، ڈاکٹر حسن الزماں صاحب کراچی کے مقتدر علماء کو اس راستے پر لگا کر اب تائب ہو گئے ہیں لیکن ان کے شاگرد جوان سے بینکاری سیکھ کر عالمی ماہرین میں شامل ہو چکے ہیں استاد کے رجوع کو قابلِ تقلید نہیں سمجھتے۔ڈاکٹر حسن الزماں کے تیار کردہ اسلامی بینکاری کے ماہرین ایک ایک بینک سے پچاس ہزار پونڈ سالانہ معاوضہ وصول کر رہے ہیں۔ڈاکٹر صدیقی کے مضمون پر ابھی تک اسلامی بینکاری کے ماہرین دم بخود ہیں۔اسلامی بینک کاری کے وکلاء کی جانب سے خاموشی بلاوجہ نہیں۔ یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ ''البلاغ'' میں آج تک ان اعتراضات کو شائع نہیں کیا گیا جو اسلامی بینکاری اور تصویر کے مسئلے پر علماء کی جانب سے اور ماہرین معیشت کی جانب سے وقتاً فوقتاً اٹھائے گئے ہیں۔جسٹس تقی عثمانی نے مصر ہندوستان اور پاکستان کے اکابر علماء اور ماہرین معیشت کی جانب سے اٹھائے گئے سوالات کو دانستہ نظر انداز کیا ہے اور ان سے مکالمے کے لیے آمادہ نہیں حالانکہ اصولی طور پر یہ ضروری تھا۔اسلامی بینکاری پر اٹھنے والے ہر سوال، ہر شک اور ہر اعتراض کا تفصیل سے جواب دیا جانا چاہیے۔اس کے لیے البلاغ کے صفحات مخصوص کیے جائیں،اس معاملے میں غص بصر کا معاملہ دین کی بنیادیں متزلزل کر دے گا]۔

دنیا بھر میں اسلامی بینکاری کے جھنڈے تلے کام کرنے والے بینک گزشتہ تقریباً ۳۰ برسوں میں بھی سودی نظام کے پیدا کردہ ظلم و ناانصافی کو ختم یا کم کرنے میں قطعی ناکام رہے ہیں حالانکہ قرآن کریم نے سود کو حرام قرار ہی اس لیے دیا تھا کہ یہ ظلم و ناانصافی کا سبب بنتا ہے۔[2:279] مسلمان ممالک نے اسلامی بینکاری کے نفاذ اور اس کے فروغ کے ضمن میں جو پالیسیاں وضع کی ہوئی ہیں اور ان ممالک میں کام کرنے والے اسلامی بینکوں نے اسلامی بینکاری کے فلسفہ اور اس کی روح کو بڑی حد تک نظر انداز کرنے خصوصاً سرمائے کی فراہمی (سودی بینکوں کے قرضوں کا نعم البدل) کے لیے سودی نظام سے بظاہر ملتے جلتے طریقہ کار اپنانے اور ان کو دوام بخشنے کی جو روش اختیار کی ہوئی ہے اسے دیکھ کر اس خدشے کو تقویت ملتی ہے کہ دنیا بھر بشمول پاکستان میں قائم اسلامی بینک اگلی چند دہائیوں میں بھی سماجی انصاف فراہم کرنے اور ظلم و ناانصافی کا خاتمہ کرنے کے مقاصد کے حصول میں نہ صرف معاونت نہیں کر سکیں گے بلکہ خود بھی استحصال کرنے کے الزامات کی زد میں رہیں گے۔

بلاسودی بینک: سودی بینکوں کے نقش قدم پر:

اس تکلیف دہ صورتحال کی ایک انتہائی اہم وجہ یہ ہے کہ ان مسلمان ملکوں میں بھی اسلامی بینک اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ سودی نظام کے تحت چلنے والے بینکوں کے نقش پا (بنچ مارک) پر چلیں۔ ان تمام مسلمان ملکوں نے جنھوں نے اسلامی بینکوں کے قیام کی اجازت دی بنیادی غلطی یہ کہ سودی بنیاد پر کام کرنے والے بینکوں کو کھلی چھٹی دی کہ وہ غیر معینہ مدت تک سود پر مبنی بینکاری کرتے رہیں اور اس ناقص حکمت عملی کے تباہ کن اثرات کا ادراک ہی نہیں کیا یا ان کو نظر انداز کیا۔

کیا اسلامی بینک غیر سودی بینک ہیں؟

اسٹیٹ بینک کا کہنا ہے کہ پاکستان میں عوام کے پاس اختیار ہے کہ وہ ان میں سے کسی بھی نظام کے تحت کام کرنے والے بینک کے ساتھ کاروبار کریں۔ ہمیں قرآن کا یہ ارشاد ذہن میں رکھنا چاہیے ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو''۔ (۲:۲۰۸) اسلامی ملکوں میں ان دنوں قسم کے بینکوں کو متوازی چلانے اور عملی طور سے سودی نظام کو دوام بخشنے کے منفی اثرات ۱۹۸۰ اور ۱۹۹۰ کی دہائی میں واضح طور سے سامنے آ چکے تھے چناں چہ اب سے کچھ برس قبل کیا گیا حکومت اور اسٹیٹ بینک کا یہ فیصلہ نا قابل فہم ہے کہ پاکستان میں سودی بینک اور اسلامی بینک ساتھ ساتھ کام کریں گے۔

اسلامی بینک نفع میں کمی سودی طریقے پر کرتے ہیں:

اس حقیقت کا ادراک ضروری ہے کہ مسلمان ممالک میں بھی سودی بنیاد پر کام کرنے والے بینک عملاً مارکیٹ کو کنٹرول کرتے ہیں کیوں کہ مسلمان ملکوں میں بینکوں کے مجموعی اثاثوں میں اسلامی بینکوں کا حصہ بہت ہی

کم ہے مثلاً ملائشیا میں اسلامی بینکوں کے مجموعی اثاثوں کا حجم ملک کے شعبہ بینکنگ کے مجموعی اثاثوں کا تقریباً ۱۰ فیصد ہے جبکہ سودی بنیاد پر کام کرنے والے بینکوں کے اثاثوں کا مجموعی حجم تقریباً ۹۰ فیصد ہے۔ پاکستان میں اسلامی بینکوں کے مجموعی اثاثوں کا حجم ملک کے شعبہ بینکنگ کے مجموعی اثاثوں کا صرف دو فیصد ہے چناں چہ جب سودی بینک شرح سود میں کمی کرتے ہیں تو اسلامی بینک بھی ان کی تقلید کرتے ہوئے شرح منافع میں کمی کر دیتے ہیں اور جب سودی نظام کے تحت کام کرنے والے بینک شرح سود میں اضافہ کرتے ہیں تو اسلامی بینک بھی شرح منافع بڑھا دیتے ہیں۔

اسلامی بینک وسودی بینک کی یکساں شرح منافع:

وطن عزیز میں سودی بنیاد پر کام کرنے والے بینکوں نے جنوری سے جون ۲۰۰۵ء کی ششماہی میں اپنے کروڑوں بچت کھاتے داروں کو ایک سے تین فیصد سالانہ کی شرح سے منافع دیا جبکہ اسلامی بینکوں نے بھی اسی مدت میں بچت کھاتے داروں کو تین فیصد سالانہ سے کم منافع دیا۔ اس مدت میں ملک میں افراط زر کی شرح تقریباً ۹ فیصد تھی چناں چہ سودی اور اسلامی بینکوں نے ۶ سے ۸ فیصد حقیقی منفی شرح سے منافع دیا۔

اسلامی بینک دگنی منفی شرح سے منافع دے رہے ہیں:

یہ بات دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ نومبر ۱۹۹۳ء میں اسٹیٹ بینک کے اس وقت کے گورنر نے کہا تھا کہ (سودی) بینک افراط زر کی شرح سے کم منافع دے کر کھاتے داروں کا استحصال کر رہے ہیں جبکہ بڑی بڑی رقوم کے قرضے لینے والوں کو (افراط زر کی شرح سے کم شرح پر قرضے دے کر) زراعانت دی جارہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا تھا کہ اسٹیٹ بینک کو چھوٹی چھوٹی بچتیں کرنے والوں کے سرمائے کو امیروں کی طرف بہاؤ کے عمل کو خاموش تماشائی بن کر نہیں دیکھنا چاہیے اور یہ کہ بینکوں کے کھاتے داروں کو افراط زر کی شرح سے کم از کم ایک فیصد زیادہ منافع ملنا چاہیے۔ یہ بات نوٹ کرنا اہم ہے کہ جس حقیقی منفی شرح سود سے منافع دینے کی وجہ سے اسٹیٹ بینک کے گورنر نے ۱۹۹۳ء میں سودی بینکوں کو استحصالی کہا تھا اب اس سے دگنی حقیقی (منفی) شرح سے اسلامی بینکوں کی جانب سے کھاتے داروں کو منافع دینے کے عمل پر اطمینان کا اظہار کیا جارہا ہے اور ملک میں ''اسلامی بینکاری'' کے فروغ کو بڑی کامیابی قرار دیا جارہا ہے۔

اسلامی بینک نقصان کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے

اسلامی بینک طے شدہ منافع قرضوں پر وصول کرتے ہیں:

اس بات کا ادراک ضروری ہے کہ اسلام سود سے پاک بینکاری کا جو نظام تجویز کرتا ہے وہ نفع ونقصان میں شرکت کی بنیاد پر ہی قائم ہوسکتا ہے لیکن بعض عملی رکاوٹوں کے سبب صرف ناگزیر صورتوں میں اور وہ بھی صرف

عبوری مدت کے لیے سرمائے کی فراہمی کے کچھ متبادل راستے علماء حضرات کی طرف سے تجویز کیے گئے تھے مثلاً مرابحہ اور بیع موجل وغیرہ لیکن دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد یہ عبوری مدت بھی گزر چکی ہے۔ سرمائے کی فراہمی کے ان طریقوں میں بینک سرمایہ لینے والی پارٹی کے نقصان میں شرکت کی ذمہ داری نہ صرف قبول نہیں کرتا بلکہ اسلامی بینک پہلے سے طے شدہ منافع سرمایہ لینے والی پارٹی سے وصول کرنے کا ہر حال میں حقدار ہوتا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ عملی طور سے منافع کا یہ حجم سودی بینکوں کی جانب سے قرضوں پر لی جانے والی شرح سود سے ہی مطابقت رکھتا ہے۔[اس طرح عملاً اسلامی بینک اور سودی بینک کے طریقہ کار میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا] اس حقیقت کا ادراک از حد ضروری ہے کہ اگر ملک میں اسلامی نظام اور سود نظام ساتھ ساتھ چلتے رہے تو موجودہ حالات میں اسلامی بینک اگر چاہیں بھی تو وہ اپنے کھاتے داروں کے ساتھ کرنے والی ناانصافی کو ختم نہیں کر سکتے کیوں کہ اس کے لیے انھیں سرمائے کی فراہمی پر لی جانے والی شرح منافع بڑھانا پڑے گی جس کے لیے ظاہر ہے کہ پارٹیاں رضا مند نہیں ہوں گی کیوں کہ کم شرح مارک اپ پر ان سودی بینکوں سے قرضہ بہر حال دستیاب ہے جو اپنے کھاتے داروں کو ان کی رقوم پر انتہائی کم شرح سے منافع دے کر ان کا استحصال کر رہے ہیں۔

سود کا بھوت اسلامی بینکوں کا پیچھا کر رہا ہے

اسلامی بینکاری میں غیر مسلموں کا عمل دخل بہت بڑھ گیا ہے:

اس پس منظر میں کچھ ماہرین کی یہ سوچ صحیح نہیں ہے کہ موجودہ نظام کے تحت نفع ونقصان میں شرکت کی بنیاد پر سرمائے کی فراہمی سے بینکوں کے کھاتے داروں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا خاتمہ کرنا ممکن ہوگا کیو ں کہ شرعی اصولوں کے مطابق شراکت کے معاہدہ میں نفع کی تقسیم کا تناسب دونوں پارٹیوں کے درمیان باہمی رضا مندی سے متعین ہوتا ہے چناں چہ شراکت کی بنیاد پر بینکوں سے سرمایہ لینے والی پارٹی اس بات کو یقینی بنائے گی کہ بینکوں کو اپنے منافع سے وہ صرف اتنا حصہ دے جو سودی بینکوں کی جانب سے قرضوں پر لیے جانے والے مارک اپ کے حجم سے مطابقت رکھتا ہو۔ البتہ جب اسلامی بینکوں کے اثاثوں کا حجم سودی بینکوں کے برابر ہو جائے گا یا بڑھ جائے گا تو پھر یہ اسلامی بینک مارکیٹ کے لیڈر بن جائیں گے اور ایک عادلانہ شرح منافع متعین کر سکیں گے۔ اس بات کا ادراک بہر حال ضروری ہے کہ اسلامی نظام بینکاری کو مکمل طور پر اور کامیابی سے چلانے کے لیے معاشرے کی اصلاح، معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا اور متعلقہ قوانین کو شریعت کے تابع بنانا بنیادی شرائط ہیں۔ لیکن ان امور کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی۔ اسلامی بینکاری کو درپیش چیلنجوں سے نمٹنا، اس کی ساکھ بہتر بنانا، اس کو الزامات کی زد سے محفوظ رکھنا اور تمام معاملات کو شفاف رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اسلامی بینکاری میں غیر مسلموں کا عمل دخل بہت زیادہ بڑھ رہا ہے اور اسلامی بینکاری کے نام پر حاصل شدہ رقوم کو یورپ اور امریکا میں

استعمال کیا جارہا ہے۔گزشتہ ماہ کراچی میں منعقدہ ایک سیمینار میں کہا گیا کہ پاکستان میں سودی نظام بینکاری پر اسلامی بینکاری کا لیبل چسپاں کردیا گیا ہے۔اسلامک ڈیولپمنٹ بینک جدہ کے انعام یافتہ مسلم ماہر معیشت ڈاکٹر حسن الزماں کا یہ بیان پہلے ہی ریکارڈ پر موجود ہے کہ سود کا بھوت اسلامی بینکوں کا بدستور پیچھا کررہا ہے۔

اسلامی بینکوں کے کھاتے داروں کا استحصال:

مندرجہ بالا گزارشات کی روشنی میں ہم فقہا وعلماء حضرات سے دردمندانہ درخواست کریں گے کہ وہ اسلامی بینکوں کی جانب سے کھاتے داروں کے استحصال کو ختم کرانے کے ضمن میں اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کریں۔اس کے لیے انھیں اول اسٹیٹ بینک کو بھی علانیہ بتلانا ہوگا کہ وہ سودی بینکوں اور اسلامی بینکوں کو غیر معینہ مدت تک ساتھ ساتھ چلنے دینے کی پالیسی کو مسترد کرتے ہیں۔

مرابحہ شرعی مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹ ہے:

یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ حکومت نے خود جون ۲۰۰۱ء میں سپریم کورٹ کے ۲۳ردسمبر ۱۹۹۹ء کے فیصلے پر عملدرآمد کے لیے عدالت عظمیٰ سے پانچ برس کی مہلت مانگی تھی۔دوم اسلامی بینکوں پر واضح کریں کہ وہ آئندہ ان کو اسلامی بینک صرف اس وقت تسلیم کریں گے جب وہ مرابحہ اور اسی طرح کے بعض دوسرے طریقوں کا استعمال کم سے کم کریں کیوں کہ یہ شرعی مقاصد کی تکمیل میں معاونت نہیں کرتے اور اسلامی بینکوں کو پابند کریں کہ ہر سہ ماہی میں پارٹیوں کو جتنا بھی سرمایہ فراہم کیا جائے اس میں نفع ونقصان میں شرکت کی بنیاد پر سرمائے کی فراہمی کا حصہ کم از کم ۵۰ فیصد ہو اور سوم یہ کہ بینکوں سے تحریری ضمانت لی جائے کہ ۳۱ردسمبر ۲۰۰۶ء تک ان کے بینک کی مجموعی فنانسنگ کا ۵۰ فیصد نفع ونقصان میں شرکت کی بنیاد پر ہوگا۔ہم سمجھتے ہیں کہ اگر شریعہ اسکالرز اسلامی بینکوں کے پیچھے اپنا وزن ڈالنے سے پہلے ان تجاویز کی پابندی کرائیں تو اسلامی بینکاری کے ثمرات نظر آنا شروع ہوجائیں گے۔

آئندہ شمارے میں

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے Clement M. Henry کی تازہ ترین کتاب The Politics of Islamic Finance پر تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔یہ کتاب دنیا بھر میں ہونے والے اسلامی بینکاری کے تمام تجربات کا علمی احاطہ کرتی اور حیرت انگیز انکشافات کرتی ہے۔

مغرب کی دہشت گردی: نئی شکلیں

ناروے کی پروگریس پارٹی جو کہ دائیں بازو کی سب سے بڑی جماعت ہے اور پارلیمنٹ میں دوسری بڑی جماعت ہے، اس جماعت کا حکومت سازی میں ہمیشہ اہم ترین کردار رہا ہے۔ اس جماعت نے ۱۲ ستمبر کو ہونے والے انتخابات کے لیے اپنی جماعت کے منشور کے سرورق پر ایک نقاب پوش شخص کی تصویر شائع کی ہے جس کے ہاتھ میں بندوق ہے اور اس کا رخ پڑھنے والے کی طرف ہے۔ اس تصویر کے نیچے درج ہے کہ ''یہ شخص غیر ملکی نسب سے تعلق رکھتا ہے۔ [رائٹر، ۵ ستمبر ۲۰۰۵ء]

پروگریس پارٹی کے سربراہ ۶۱ سالہ کارل ہیگل نے مہاجرین میں کمی، ٹیکسوں میں کٹوتی اور ناروے کی تیل کی دولت سے حاصل ہونے والی آمدنی ناروے کے ریٹائر ہونے والے شہریوں پر خرچ کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اب یہ جماعت اپنے ''مہاجرین مخالف'' تصور کو ابھار کر اپنی جماعت کو وسعت دینا چاہتی ہے۔

ناروے میں دوسرے اسکینڈے نیوبائی ممالک (شمالی امریکہ کے ممالک ناروے، ڈینمارک اور سویڈن) کی نسبت سب سے زیادہ یک رنگی پائی جاتی ہے۔ مہاجرت کی چند دہائیوں کے دوران یہاں غیر مغربی مہاجرین کی تعداد ناروے کی کل آبادی جو کہ ۴٫۵ ملین ہے کا صرف ۶ فیصد ہے جو کہ یورپی ممالک کے لحاظ سے بہت کم ہے۔

پروگریس پارٹی کے پارلیمانی سیکریٹری کا کہنا ہے کہ مہاجرین کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ ناروے کی زبان نہیں سیکھتے اور ریاست کے بہت سے ذرائع آمدنی ان کی فلاح و بہبود پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ زیادہ تر جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔

پروگریس پارٹی جو اس سے قبل ۱۵ فیصد ووٹ حاصل کرتی رہی ہے اس الیکشن میں اس نے ۲۰ فیصد ووٹ حاصل کیے ہیں۔

بعض ماہرین سیاسیات فرانس کے نیشنل فرنٹ اور آسٹریلیا کی فریڈم پارٹی اور ناروے کی پروگریش پارٹی میں بے شمار مشابہتیں محسوس کرتے ہیں، ان کے خیال میں یہ تینوں جماعتیں قومی عصبیت بیدار کر کے مہاجرین کے خلاف شدید ردعمل پیدا کر کے اپنے ووٹ بینک کو وسیع کرنا چاہتی ہیں کیونکہ قومی عصبیت ایک طاقت ور ہتھیار ہے۔ دہشت گردی کی اس شکل پر مغربی ذرائع ابلاغ مجرمانہ خموشی کا ارتکاب کرنے میں عاقبت محسوس کرتے ہیں۔ جرمنی میں انتخابات میں کرسچین ڈیموکریٹ پارٹی نے برتری حاصل کر لی اور چانسلر کا عہدہ بھی اسے مل گیا ہے۔ اگر مغرب میں کوئی سیاسی جماعت نسل پرستی، وطن پرستی، قوم پرستی، نفرت، عصبیت، مذہب کے نام پر نفرت پھیلا کر، لوگوں کے خدمات ابھار کر لوگوں سے ووٹ حاصل کرے، تو یہ روشن خیالی اور جدیدیت ہے لیکن اگر انہی بنیادوں پر کوئی سیاسی جماعت عالم اسلام میں انتخابی مہم چلائے تو وہ سب جاہل، گنوار، دہشت گرد ہیں۔ قول و فعل کا یہ تضاد تضاد نہیں ہے۔ فلسفہ مغرب کی اصل بنیاد یہی ہے مگر عالم اسلام کے اکثر مفکرین فلسفہ مغرب سے ناواقف ہیں اور مغرب کے اس طرز عمل کو حقیقت سمجھنے کے بجائے منافقت سمجھتے ہیں اور مغرب سے فریاد کرتے ہیں کہ وہ اپنے اصول پر عمل کرے جب کہ مغرب کا اصول یہی ہے کہ تمام خرابیاں مغرب سے باہر ہیں وہ الحق اور المیز ان ہے۔

ثانیہ کے خلاف فتویٰ پر شیعہ مسلم بورڈ کا ردِّعمل

روز نامہ جنگ کے مطابق آل انڈیا شیعہ مسلم پرسنل لاء کے بورڈ کے چیئر مین مرزا محمد اطہر نے بھارتی ٹینس اسٹار ثانیہ مرزا کے بارے میں دیے گئے ایک فتوے کو مسترد کرتے ہوئے علماء سے کہا ہے کہ وہ کھیلوں کے معاملے میں دخل اندازی نہ کریں۔لکھنو میں صحافیوں سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ثانیہ کے خلاف بعض علماء کی طرف سے جاری کردہ فتویٰ غیر ضروری ہے کیوں کہ یہ ان لوگوں کا کام نہیں ہے کہ وہ کھلاڑیوں کو یہ بتائیں کہ کھیلتے وقت انہیں کیسا لباس پہننا چاہیے۔انھوں نے کہا کہ علماء کو کھیلوں کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ بعض علماء نے ایک ایسی کھلاڑی کے خلاف فتویٰ جاری کیا ہے جس نے یو ایس اوپن میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کر کے مسلمانوں اور ملک کا نام روشن کیا ہے۔انھوں نے کہا مختلف کھیلوں کے لیے لباس کے الگ الگ ضابطے ہیں اور اس کا فیصلہ کھلاڑی خود بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔انھو ں نے کہا کہ ثانیہ کے لباس پر فتوے جاری کر کے اس کی حوصلہ شکنی نہ کی جائے۔[جنگ،۱۲ر ستمبر ۲۰۰۵ء]

مرزا محمد اطہر صاحب کا یہ فتویٰ عالم اسلام میں جدیدیت کی بڑھتی ہوئی لہر کا ایک واضح اثر ہے مغربیت کے زیر اثر اب ہر فرد کو اس بات کا اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ دینی احکام کا تعین اپنی صواب دید پر خود کر سکے سوال یہ ہے کہ پھر شریعت کی کیا ضرورت ہے اگر شریعت آپ کی خواہش،نفس کی تمنا،دل کی رضا اور وحی کی روشنی کے بغیر ذہن کے رسا ہو جانے کا نام ہے تو قرآن اسے شرک سے تعبیر کرتا ہے اور یہ بدترین شرک ہے جب کوئی فرد اپنے نفس کو الہ بنالے اور نفس کی بارگاہ میں سجدہ ریزی کرے چند دن پہلے دیو بند سے ایک فتویٰ جاری کیا گیا جس میں انتخابی مہم میں شریک خاتون کے لیے ساتر لباس لازمی قرار دیا گیا تھا بھارت میں بعض ترقی پسند تنظیموں نے شور مچایا تو دار العلوم دیو بند کے مہتمم نے ایک بیان کے ذریعے بتایا کہ دیو بند آئندہ سیاسی مسائل میں فتویٰ جاری نہیں کرے گا اس کی تفصیلات ستمبر کے اداریے میں مطالعہ کی جا سکتی ہیں یہ طرز عمل ایک خطرناک طوفان کی نشان دہی کر رہا ہے۔کاش علماء کرام اس کا ادراک کر سکتے۔

ساحل اکتوبر ۲۰۰۵ء

امریکی معیشت: اقوام متحدہ کی ایک فکرانگیز رپورٹ

امریکہ تیزی سے زوال پذیر ہے

اقوام متحدہ کے ترقیاتی ادارہ کی حالیہ رپورٹ کے مطابق دنیا کا پانچواں حصہ ایسے ممالک میں رہتا ہے جہاں بہت سارے لوگ ہر روز کافی کے ایک پیالہ پر دو ڈالر خرچ کر دینے کو بالکل معمولی بات سمجھتے ہیں۔ بنی نوع انسان کا ایک اور پانچواں حصہ یومیہ ایک ڈالر سے بھی کم آمدنی پر گزر بسر کرنے پر مجبور ہے۔ یہ لوگ ایسے ممالک میں آباد ہیں جہاں بچے محض اس لیے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں کہ انھیں مچھر دانیاں میسر نہیں دنیا کے پانچ سو امیر ترین افراد کی کل آمدنی ۴۱ کروڑ ۶۰ لاکھ غریب ترین افراد کی کل آمدنی سے کہیں زیادہ ہے۔ امریکہ کے رائے شماری بیورو (Census Bureau) کے جاری کردہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ ۱۹۹۹ء سے اب تک وہاں کے غریب ترین (۲۰) بیس فیصد باشندوں کی آمدنی میں 8.7 فیصد کمی واقع ہوئی ہے صرف گزشتہ ایک سال میں مزید گیارہ لاکھ امریکی غربت کی لکیر تک آ پہنچے ہیں ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ امریکی باشندے پہلے ہی افلاس کی زد میں تھے۔ عراق میں جاری جنگ کا خرچہ چھ ارب ڈالر روزانہ ہے۔ کم و بیش یہی صورت حال افغانستان میں ہے۔ امریکی سرمایہ کار تمام صنعتیں چین، بھارت اور ایشیا میں لگا رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی امریکہ میں بے روزگاری میں شدید اضافہ ہوا ہے کیونکہ بیرون ملک سرمایہ کاری سے روزگار غیر ملکیوں کو حاصل ہوا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں اس وقت لوگوں کی قوت خرید اور آمدنی میں پچاس فی صد کمی ہوگئی ہے امریکہ دنیا کی سب سے مقروض معیشت ہے۔ امریکہ کو جس معیشت پر فخر تھا وہ تیزی سے زوال پذیر ہے۔ اس کا کروفر چند سالوں کی بات ہے۔ امریکہ سے خوف زدہ لوگ اس کی کھوکھلی معیشت اور کھوکھلی طاقت کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی کے باعث اس کو فضاء و ہوا میں برتری حاصل ہے۔ لیکن عراق اور افغانستان جیسے دنیا کے پسماندہ ترین ملکوں میں اسے زمین پر اقتدار حاصل نہیں ہوسکا۔ یہ ناکامی کیا بہت معمولی ہے۔ کاش لوگ اس غیر معمولی شکست کا اندازہ کر سکتے۔

کترینا طوفان: امریکہ کا اصل چہرہ یہی ہے

کترینا طوفان کے بعد دنیا کے اخبارات میں صفحہ اول کی زینت بننے والی تصاویر کے بارے میں عموماً لوگ یقین کرنے پر تیار نہیں تھے کہ یہ عالمی طاقت امریکہ کی تصاویر ہیں جس میں غربت اور افلاس زدہ امریکی شہریوں کی لاشیں بے یارومددگار پڑی ہیں اور تدفین کی منتظر ہیں یہ ایسے ملک کے مناظر تھے جسے دنیا کی واحد مطلق العنان طاقت ہونے کا اعزاز حاصل ہے جس کے پاس سائنس اور ٹیکنالوجی کی مافوق الفطرت قوتوں کا سرچشمہ موجود ہے۔ مگر یہ سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی چلائی ہوئی ہواؤں اور طوفان ابروباد کے سامنے تنکے سے بھی زیادہ حقیر ثابت ہوا۔

نیویارک ٹائمز کے رپورٹر کے مطابق:

I have seen such scenes before, but always from farway places. In third world nations but not here.

[میں نے ایسے مناظر اس سے قبل بھی دیکھے ہیں مگر یہ دور دراز کے تیسری دنیا کے ممالک کے ہوتے ہیں۔ امریکہ کے نہیں] امریکی رپورٹر کا تبصرہ اس کبر غرور کا اعلان ہے کہ وہ امریکہ کو مافوق الفطرت طاقت سمجھتے ہیں جہاں تیسری دنیا کے مناظر نظر نہیں آسکتے۔ سائنس کے خدا کی پرستش کے بعد وہ تمام آلام ومصائب سے محفوظ ہیں اور دنیا کی مصیبتیں امریکہ کا رخ نہیں کرسکتیں۔

نیو آرلین اور مسی پی کے ساحلوں پر بسنے والی آبادی انتہائی غریب ہیں اعداد وشمار کے مطابق یہاں کی آبادی پانچ لاکھ ہے۔ ستر فیصد آبادی کالے امریکیوں پر مشتمل ہے جو خط غربت سے نیچے زندگی بسر کررہے ہیں ان مفلوک الحال لوگوں کا پرسان حال کوئی نہ تھا۔ ان ریاستوں میں بچوں میں غربت کی شرح ۵۰ فی صد ہے جو پورے ملک میں سب سے زیادہ ہے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی طرح امریکہ میں غربت کی زندگی گزارنے والوں کا تعلق نسلی اور لسانی اقلیتوں سے ہے جن کے ساتھ تاریخی طور پر متعصّبانہ اور جابرانہ رویہ روا رکھا

گیا ہے۔اسی کا نام مساوات انسانی،حقوق انسانی،انسانیت ہے۔

اکثر ترقی یافتہ ممالک کی طرح امریکہ میں امیر اور غریب کے درمیان فاصلہ نہ صرف بہت زیادہ ہے بلکہ امریکہ جو سب سے بڑی ترقی یافتہ ریاست ہے یہاں یہ فاصلہ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔یہ فاصلہ سرمایہ داری کا لازمی نتیجہ ہے دنیا میں جہاں بھی نظام سرمایہ داری غالب ہوگا معیارِ زندگی بلند ہوگا آبادی تیزی سے کم ہوگی وسائل تیزی سے بڑھیں گے لیکن غربت بڑھ جائے گی سرمایہ دارانہ طرز فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے۔Federal Emergency Management Agency (FEMA) کے ڈائریکٹر مائیکل براؤن نے کہا:

> Storms victims bore substantial responsibility for their own plight.

براؤن سرمایہ داری کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

> "Unfortunately thats going to be attributable to people who did not need to advance warning (to evacuate.")

مسی پسی کے باشندوں کے نمائندےBennie Thompson کا کہنا ہے ایک چیز جسے لوگ نظر انداز کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ:قدرتی آفت اپنی جگہ اس آفت سے بچانے کے لیے سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی کیوں کہ متاثرین گورے نہیں کالے تھے اور کالے بہرحال اس تکریم کے مستحق نہیں جو گوروں کو حاصل ہے۔

> a lot of black here don't have their own means of transportation. So when you say evacuate a person who doesn't have a car what are you saying? Most of these people were not able to go:
>
> Indeed about one third of the New Orleans half million residents don't own a car. Even those who stayed at home because without credit card or cash or a clear plan worked out by FEMA a local disaster agency in the words of Florida representative slaphanie tubbs Jones, they never had no place to go

نیویارک ٹائمز کی صفحہ اول کی خبر کے مطابق:

"There has been growing sense that race and class are the unspoken markers of who got out and who got stuck". "Lawlessness is inevitable companion of mass poverty".

لندن سے شائع ہونے والی ڈیلی میل کی سرخی اس طرح ہے:

"Third World America".

ان تمام خبروں، سرخیوں اور تبصروں کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ امریکہ ناقابلِ تسخیر تھا وہ پوری دنیا کو تیسری دنیا کہتا ہے وہ اب خود تیسری دنیا کا حصہ کیسے نظر آ رہا ہے امریکیوں کے لیے یقین کرنا مشکل ہے کہ قدرتی آفات کے سامنے ہم اتنے بے بس ہیں آخر ہماری سائنس وٹکنالوجی کیا کر رہی ہے اس پورے تناظر میں کسی امریکی صحافی، اخبار، پریس اور تجزیہ نگاروں کو خالق ارض وسماء کے وجود کا احساس نہ ہوا وہ سائنس وٹکنالوجی کی غیر تسلی بخش ترقی پر نوحہ کناں تھے۔ مگر یہ ماہرین یہ نہیں بتاتے کہ لوٹ مار کے مال پر صنعتی ترقی کرنے والے ممالک نے اوزون لہر کو تباہ کر دیا ہے موسم کا توازن بگڑ گیا ہے اور طوفانوں نے دنیا کا رخ کر لیا ہے اس کا اصل ذمہ دار بھی امریکہ اور یورپ ہے۔

اکثر تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ صدر بش کی عراق کی پالیسی کی وجہ سے امریکہ کے وسائل اس حد تک ختم ہو چکے ہیں کہ اب اس کے پاس قدرتی آفات سے نمٹنے کے لیے وسائل نہیں ہیں۔ اور بعض کا خیال ہے کہ کترینہ کا طوفان صدر بش کی ان افراد کی مخالفت کا مضحکہ اڑا رہا ہے جو عالمی درجہ حرارت جیسے اہم مسئلے سے نمٹنے کی کوششوں میں مصروف ہیں بعض ماہرین کے مطابق عالمی درجہ حرارت کے بڑھنے کا عمل ایسے طوفانوں کی شدت میں اضافے کا سبب ہے۔ عالمی درجہ حرارت بڑھانے کی بھی اصل ذمہ داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔

سونامی، قطرینا، ریٹا، جیسے طوفان بادوباراں کے سامنے مغرب کی سائنس وٹیکنالوجی بے بس ہے۔ پاکستان میں آنے والا زلزلہ بھی جدید سائنس کی بے بسی کا اعلان ہے۔ انسان نے خدائی کے بہت دعوے کیے لیکن ہر عشرے کے بعد خدا اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے، لیکن مغرب کا انسان خدا پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں، پاکستان میں تو زلزلہ اچانک آیا، قطرینا اور ریٹا تو آنے سے پہلے اپنی آمد کے نقارے بجا رہے تھے، نقارے سننے والے تمام سائنس دان، ناسا، صدر بش، سب طوفان کے سامنے بے بس تھے جس طرح موت کے سامنے سب بے بس ہیں۔ اس کے باوجود دنیا کے اکثر لوگ اور عالم اسلام کے بعض علماء امریکہ سے لرزہ براندام ہیں اور اس سے مصالحت کے طلب گار ہیں۔

دانش کے خزانے چنوں کے لفافوں میں

میں چنوں کا لفافہ کوڑے دان میں پھینکنے لگا تھا لیکن اچانک رک گیا مجھے یاد آیا کہ میں یہ لفافہ پڑھے بغیر پھینک رہا ہوں مدتوں سے میرا طریقہ یہ ہے کہ میں سودے میں آنے والے ہر کاغذ، لفافے کو غور سے پڑھتا ہوں [چناں چہ یقین کیجیے آج تک وہ تمام لفظ، وہ تمام فقرے جنھوں نے میری زندگی میں بنیادی کردار ادا کیا جنھوں نے میری سوچ میرے عمل کے دھارے بدل دیے وہ فقرے وہ لفظ مجھے انہی لفافوں، اخبار کے انھی کٹے پھٹے کاغذوں سے ملے چناں چہ میری زندگی میں یہ لفافے بڑی اہمیت رکھتے ہیں] میں واپس گاڑی میں بیٹھا کاغذ کی گیند کھولی لفافہ سیدھا کیا اس کے کنارے کھولے اور اسے جھولی میں پھیلا کر پڑھنے لگا یہ نفسیات کی کسی کتاب کا ایک ورق تھا اس پر ولیم کا خوبصورت فلسفہ درج تھا۔

میں ولیم جیمز کے بارے میں بس اتنا جانتا تھا، یہ ایک معروف نفسیات دان تھا اور خود کو سگمنڈ فرائیڈ کا شاگرد کہتا تھا، باقی اس نے زندگی میں کیا کیا کام کیے، میں ان سے نابلد تھا لیکن اس کاغذ پر درج وہ فلسفہ کمال تھا، اس نے کہا ''انسان کے ہر جذبے کے ساتھ ایک فعل وابستہ ہوتا ہے مثلاً اگر وہ دکھی ہو تو وہ روتا ہے، وہ خوش ہو تو ہنستا ہے، وہ غصے میں آئے تو وہ چیختا چلاتا ہے، محبت کرے تو وہ پچکارتا ہے، بوسہ لیتا ہے، خوفزدہ ہو تو بھاگتا ہے، وہ کامیاب ہو تو چھلانگیں لگاتا ہے تالیاں پیٹتا ہے اور وہ بھوکا ہو تو ندیدے پن کا مظاہرہ کرتا ہے۔'' اگر انسان اس عمل کو الٹا دے، وہ کسی جذبے سے وابستہ فعل یا عمل دہرانا شروع کر دے تو تھوڑی ہی دیر میں اس میں اس عمل یا اس فعل سے وابستہ جذبہ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہ اقتباس مشہور کالم نویس جاوید چوہدری کے تازہ کالم سے لیا گیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ پاکستان کے بیشتر کالم نویسوں کی دانش، عقل، کے ماخذات چنوں کے لفافوں میں بند ہیں۔ پاکستانی کالم نگاروں کے تجزیے اور مطالعے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جاوید چوہدری کل تک ایک مذہبی، جہادی بنیاد پرست کالم نگار تھے روزنامہ ''اسلام'' کی رہنمائی فرما رہے تھے لیکن اپنے تازہ کالم میں انھوں نے زلزلے کا سبب صرف اور صرف ناقص تعمیرات کو قرار دیا ہے اور حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ جاپانی طرز تعمیر اختیار کر کے زلزلوں کو شکست دے دی جائے۔ زلزلہ جاوید چوہدری جیسے کالم نگار کی زندگی، تحریر اور عقیدے میں کوئی زلزلہ پیدا نہ کر سکا اس زلزلے سے فکر آخرت، انذار یاد خدا کا کوئی پہلو ابھر نہ سکا، ہمارے تمام پاکستانی کالم نگار چنوں کی دانشوری کا ثمر ہیں۔

جنرل مشرف کا بیان: جدیدیت پسندوں کا اندرونی مسئلہ

این جی اوز کے نام پر اربوں کھربوں روپے کمانے والی اعلیٰ خاندانوں کی عورتوں اور مردوں کو جو پاکستانی معاشرے میں جدیدیت کے علمبردار ہیں اس وقت شدید دھچکہ پہنچا جب جدیدیت پسندوں کے عالمی مسلم رہنما جنرل مشرف نے جنھیں امریکہ کی مکمل تائید وحمایت حاصل ہے واشنگٹن پوسٹ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

"You must understand the environment in Pakistan. This has become a money-making concern. A lot of people say if you want to go abroad and get a visa for Canada or citizenship and be a millionaire, get yourself raped."

جدیدیت پسند جنرل مشرف کے اس بیان نے ان کے فطری حلیف اور حامی جدیدیت پسندوں کو سخت دھچکا پہنچایا، امریکہ میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ جنرل مشرف نے وضاحت پیش کی۔

He had said no such thing. Indeed that he would have been stupid to say it.

لیکن جنرل مشرف کی یہ وضاحت قابل قبول نہ تھی۔ انٹرویو لینے والے صحافی نیویارک ٹائمز کے نکولس کرسٹوف نے برجستہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا جنرل صاحب نے سچ فرمایا واشنگٹن پوسٹ نے وضاحت کی کہ جنرل صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا وہی شائع کیا گیا ہے۔ ان کے تمام الفاظ ہمارے ٹیپ کے مطابق ہو بہو نقل اور شائع کیے گئے ہیں۔ جنرل مشرف اس وضاحت کے بعد خاموش ہوگئے۔ خاموشی کے سوا چارہ نہ تھا، ان کا بیان درست تھا یا غلط ہمیں اس سے بحث نہیں، یہ جدیدیت پسندوں کا خانگی مسئلہ ہے، گھر کا حال گھر والا ہی بہتر جانتا ہے۔ جنرل صاحب نے کچھ کہا ہے تو یقیناً سوچ سمجھ کر کہا ہوگا۔ جدیدیت پسندوں کی آوارگی سے وہ بخوبی واقف ہیں اور اس کے ہولناک نتائج سے خوف زدہ بھی ہیں۔

جنرل صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ڈاکٹر شازیہ کیس پر یہ تبصرہ بھی فرمایا:

"It is the easiest way of doing it. Every second person now wants to come up and get all the [pause] because there is so much of finances. Dr. Shazia, I don't know. But maybe she's a case of money (too), that she wants to make money. She is again talking all against Pakistan, against whatever we've done. But I know what the realities are."

نیویارک میں پاکستانیوں کے ایک اجتماع میں جب ایک جدیدیت پسند عورت نے جدیدیت پسند پاکستانی صدر سے پاکستانی عورتوں کو زانی و بدکار قرار دینے پر احتجاجی سوال کیا تو جنرل صاحب آپے سے باہر ہوگئے۔ جدیدیت پسندوں کا پوری دنیا میں یہی رویہ ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کو انتہا پسند قرار دیتے ہیں علماء کو گالیاں دیتے ہیں جب کہ خود متشدد ہوتے ہیں۔ ڈان کے مطابق:

"Provoked by a single question, the president allowed an event held to promote his government's pro-woman policies to degenerate into a bout between himself and part of the invited audience... "I am a fighter, I will fight you. I do not give up and if you can shout, I can shout louder... Responding to (a) woman's charge that he had retracted his interview to The Washington Post, (he) said: "Lady, you are used to people who tell lies. I am not one of them." When a woman raised her voice to ask a question, the president said: "Are you a Benazir supporter?"

نیویارک میں جدیدیت پسندوں کے مابین اس جدال کا انجام ڈان کے مطابق اس طرح ہوا:

"Pakistan's ambassador to the US Jehangir Karamat, who was Gen. Musharraf's senior in the army, approached the podium and moved the president away by gently patting his shoulders".

این جی اوز پاکستان اور اسلام کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ لیکن انھیں اس کی آزادی ہے لیکن جب انہی این جی اوز نے جنرل صاحب کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی کوشش کی تو جنرل صاحب اسلامی اقدار کے محافظ بن گئے۔ جدیدیت پسندی اسی طرح رنگ بدلتی ہے۔